علامہ محمد اسد کی مشہور کتاب
ISLAM AT THE CROSS ROADS
کا اردو ترجمہ

مسلمانوں کو درپیش عصر حاضر کے چیلنج اور قرآن وسنت کی روشنی میں نجات کا راستہ

ملت اسلامیہ دوراہے پر

یہ ایک ایسے صاحب علم نومسلم کی تصنیف ہے جنھوں نے یورپ کے مادّہ پرست اور بے راہرو معاشرے میں یہودی گھرانے میں آنکھ کھولی مگر اپنی جوانی میں انھیں عالم اسلام کی بھرپور سیاحت اور اسلام کے چشمۂ صافی سے علمی پیاس بجھانے کا موقع ملا تو دین متین کی خالص تعلیمات کے زیر اثر وہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ پھر ان کی پوری زندگی قرآن وسنت کی اشاعت وتبلیغ میں صرف ہوئی اور امت مسلمہ کو موجودہ ادبار ونکبت سے نکالنے کے لیے انہوں نے اپنے قلم کا بھرپور استعمال کیا۔

زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے جس میں نومسلم علامہ محمد اسد نے مغربی تہذیب اور مسیحیت کے فکری تاروپو بکھیرے ہیں اور ملت اسلامیہ کو مغرب کی اندھی تقلید سے بچنے' اسلامی معاشرت کے تحفظ' قرآن وسنت کی تعلیمات کو مکمل طور پر اپنانے اور مغرب کی فکری یلغار کے مقابلے میں معذرت خواہانہ رویہ ترک کرنے کی تلقین کی ہے۔ مفسر قرآن محمد اسد کی اس تصنیف کا مطالعہ اسلام سے رُوگردانی اور بے عملی کے اس دور میں اسلام سے سچی وابستگی اور فکری وعملی اصلاح کا ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔

فہرست مضامین

www.ebooksland.blogspot.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

(آل عمران، 3/110)

"تم دنیا میں وہ بہترین گروہ ہو جسے انسانی ہدایت اور اصلاح کے لیے میدان (عمل) میں لایا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو"

عرضِ ناشر

علامہ محمد اسد رحمہ اللہ گزشتہ صدی کے ایک عظیم نومسلم سکالر تھے۔ ان کی انگریزی تصنیف "اسلام ایٹ دی کراس روڈز" ساٹھ ستر سال قبل برصغیر میں پہلے دہلی اور پھر لاہور سے شائع ہوئی تھی جسے ہم اب اُردو میں "ملتِ اسلامیہ: دوراہے پر" کے عنوان سے شائع کر رہے ہیں۔ اس کتاب میں علامہ اسد نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے یہ کہا ہے کہ "وہ مغربی سماجی اقدار کی اندھی تقلید ترک کر دیں اور اس کے بجائے اپنے اسلامی ورثے کو محفوظ کرنے کی کوشش کریں جس نے کسی زمانے میں کثیر الجہتی اور تاریخی طور پر شاندار مسلم تہذیب کو جنم دیا تھا۔"

وہ "اسلام کی صراطِ مستقیم" کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں: "اسلام ہمیں ترکِ دنیا پر مجبور نہیں کرتا اور نہ روحانی تزکیے کے لیے کسی خفیہ دروازے کو کھولنے کے لیے ریاضتوں پر مجبور کرتا ہے۔ اسلام کا کوئی راہبانہ فلسفہ نہیں بلکہ اسلام تو قوانینِ فطرت کے مطابق زندگی گزارنے کا لائحہ عمل بتاتا ہے جس کا حکم خالق نے اپنی مخلوق کو دیا ہے۔"

وہ اسلام کی اخلاقی بنیاد کا خاکہ پیش کرنے کے بعد واضح کرتے ہیں کہ مغربی تہذیب کی روحانی جڑیں بت پرست رومی تہذیب میں پیوست ہیں لہٰذا مسلمانوں کو مغربی تہذیب کی نقالی سے گریز کرنا چاہیے کیونکہ مسلم تہذیب اور مغربی تہذیب میں کوئی روحانی مطابقت نہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے تاریخی تجربات خصوصاً صلیبی جنگوں کا جائزہ لے کر مغرب کی اسلام دشمنی بھی واضح کی ہے۔

علامہ محمد اسد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ "مغربی خطوط پر مسلم نوجوانوں کی تعلیم جو مغرب کے

www.ebooksland.blogspot.com

ثقافتی تجربات اور اقدار پر مبنی ہے اُن کیلئے نہایت ہلاکت خیز ہے۔ اس کے نتیجے میں ان کے دینی عقائد رفتہ رفتہ کمزور پڑتے جا رہے ہیں..... زوال کی موجودہ صورتِ حال میں بہت سے مسلمان گھرانوں کا مذہبی ماحول اور عقلی معیار بہت پست ہو گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ نوجوان مذہب کو پس پشت ڈال دیں یا وہ اپنی زندگی میں مذہب مخالف رویہ اختیار کر لیں۔"

علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے انتباہ کیا ہے کہ "مسلمانوں کو ہر چیز مغربی آنکھ سے دیکھنے اور مغربی اندازِ فکر اختیار کرنے کی خواہش ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔ اگر وہ مسلمان رہنا چاہتے ہیں تو انہیں اسلام کی روحانی تہذیب کا مغرب کے مادہ پرستانہ تجربات سے تبادلہ کرنے کی خواہش بھی نہیں کرنی چاہیے۔"

وہ کہتے ہیں کہ "مسلمانوں کو مغرب سے صرف سائنسی علوم سیکھنے پر اکتفاء کرنا چاہیے لیکن ان کا فلسفہ مسترد کر دینا چاہیے۔" نیز مسلم تعلیمی اداروں میں "یورپی فلسفہ، ادب اور تاریخ کو اولیت نہ دی جائے کیونکہ اس سے فطری طور پر نوجوانوں کے کچے ذہنوں میں ان کے منفی پہلو جانے بغیر مغربی تہذیب کی روح پیدا ہو جاتی ہے اور مغربی اقدار پر مبنی سماجی نظام کی عملاً نقالی شروع ہو جاتی ہے جو اسلام کی روح کے خلاف ہے۔"

یہ صورتِ حال کس قدر المناک اور تکلیف دہ ہے کہ علامہ محمد اسد رحمۃ اللہ علیہ نے پون صدی پہلے جن خدشات کا اظہار کیا تھا وہ اب خوفناک اور مجسم شکل میں سامنے آ رہے ہیں۔ آج عالم اسلام میں مغربی تعلیم کے فروغ کے باعث نوجوان نسل اپنی شناخت کے بحران سے دوچار ہے، مغربی تہذیب اپنے تمام تر ثقافتی ذرائع سے اس پر حملہ آور ہو چکی ہے اور اسلامی معاشرے کے ستون ایک ایک کر کے کمزور پڑتے جا رہے ہیں۔

علامہ محمد اسد رحمۃ اللہ علیہ "حدیث اور سنت" کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں کہ "اسلام زندگی کے تمام گوشوں کے لیے رہنمائی فراہم کرتا ہے جس میں نہ کچھ اضافہ کیا جا سکتا ہے اور نہ کمی کی جا سکتی ہے۔ قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ نے ہمیں جو بھی تعلیم دی ہے، ہمیں اس کو مکمل طور پر اختیار کرنا ہو گا ورنہ ہم اس کی قدر و قیمت سے محروم رہیں گے۔"

وہ سنت کی اہمیت یہ کہہ کر واضح کرتے ہیں کہ "تمام معاملات میں سنت کی پابندی کرنا اسلام پر عمل کرنا ہے اور سنت کو ترک کرنا اسلام کی حقیقت سے روگردانی کرنا ہے۔"

آخری نتیجہ خیز باب میں وہ لکھتے ہیں: "ہمیں اسلام کی اصلاح کرنے کی ضرورت نہیں جیسا کہ بعض مسلمان سمجھتے ہیں کیونکہ اسلام ہر لحاظ سے مکمل دین ہے۔" وہ ہمیں اسلام کے متعلق معذرت خواہانہ رویہ ترک کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور پُر زور طور پر کہتے ہیں کہ "ہمیں ایک بار پھر اسلام کو وہ معیار بنانا چاہیے جس کی کسوٹی پر دنیا کو پرکھا جا سکے۔"

حقیقت یہ ہے کہ امتِ مسلمہ کے ادبار و نکبت اور دینِ اسلام سے بے رخی اور بے عملی کے اس دور میں علامہ محمد اسد رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تصنیف مشعلِ راہ ہے، لہٰذا ادارہ دارالسلام اسے اردو خواں طبقے کی خدمت میں فخر سے پیش کر رہا ہے۔ ڈاکٹر محبوب سبحانی صاحب نے کتاب کا خوب ترجمہ کیا ہے اور اس کی تصحیح و تنقیح میں رکنِ ادارہ جناب محسن فارانی نے خاصی کاوش سے کام لیا ہے۔

قارئین سے التماس ہے کہ وہ ادارہ دارالسلام اور اس کے کارکنان کے حق میں دعائے خیر کریں۔

20 جمادی الاولیٰ 1425ھ
9 جولائی 2004ء

خادمِ کتاب و سنت
عبدالمالک مجاہد
دارالسلام، الریاض - لاہور

❋ ❋ ❋

www.ebooksland.blogspot.com
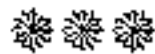
ذکر کچھ مصنف کا

علامہ محمد اسد مرحوم ' جن کا پیدائشی نام لیوپولڈ ویس (Leopold Weiss) تھا' 1900ء میں لیوو (Livow) آسٹریا کے ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوئے (لیوو آج کل پولینڈ میں شامل ہے)1922ء میں وہ ایک مشہور جرمن جریدے فرینکفرٹر زائتونگ (Frankfurtur Zeitung) کے نمائندے کے طور پر مشرق اوسط آئے اور مختلف عرب ممالک میں تعینات رہے۔ اس دوران میں وہ شمالی افریقہ سے لے کر سطح مرتفع پامیر (وسط ایشیا) تک عالم اسلام میں گھومے پھرے اور پھر اپنی تقریباً تمام عمر یہیں گزار دی۔ عالم اسلام کے سماجی نظام کے مطالعے سے انہیں اسلامی تعلیمات میں دلچسپی پیدا ہوئی اور غور و خوض کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ "مسلمانوں کے سماجی و ثقافتی زوال کی ایک ہی وجہ ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے رفتہ رفتہ اسلامی تعلیمات پر ان کی روح کے مطابق عمل کرنا چھوڑ دیا ہے۔" 1925ء میں وہ افغانستان کے پہاڑوں کی سیر و سیاحت کر رہے تھے جب افغانی صوبائی گورنر نے اسلام سے ان کا شغف دیکھ کر ان سے کہا: "تم مسلمان ہو مگر تم جانتے نہیں۔" وہ اس پر چونکے اور پھر اگلے سال یورپ واپس گئے تو انہیں محسوس ہوا کہ "اسلام کے بارے میں میرے رویے کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ میں اسلام قبول کر لوں۔" چنانچہ وہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے اور اسلامی نام محمد اسد اختیار کر لیا۔ یاد رہے لیو (Leo) اور "اسد" دونوں کے معنی "شیر" کے ہیں۔

قبول اسلام کے بعد محمد اسد سعودی حکمران شاہ عبدالعزیز کے مشیر رہے۔ اس دوران میں انہوں نے عربی زبان سیکھی اور تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں رہ

کر انہیں ان اصل حالات کا کچھ اندازہ ہوا جن میں نبی اکرم ﷺ نے اسلام کی تبلیغ کی تھی۔ مطالعے اور موازنے سے ان کے دل میں یہ یقین راسخ ہو گیا کہ مسلمانوں کی اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کے باوجود اسلام کا روحانی اور سماجی نظام اب بھی انسانیت کے لیے بہت بڑی قوت محرکہ ہے اور پھر علامہ اسد کی تمام سرگرمیوں کا محور اسلام کا احیاء بن گیا۔ سعودی عرب میں تقریباً چھ سال گزارنے کے بعد وہ برصغیر چلے آئے اور 1934ء میں ان کی زیر نظر کتاب Islam at the Crossroads دہلی سے شائع ہوئی۔ اس دوران برصغیر کے اہل علم خصوصاً علامہ اقبال اور سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ سے ان کے خاص مراسم رہے۔ وہ دارالاسلام (پٹھان کوٹ) میں بھی مقیم رہے۔

قیام پاکستان کے بعد علامہ محمد اسد مغربی پنجاب کے ڈائریکٹر اسلامی تعمیر نو کے منصب پر فائز رہے۔ پھر انہوں نے پاکستان کی وزارت خارجہ میں بطور ڈائریکٹر کام کیا۔ وہ پاکستان کے اسلامی آئین کی تیاری کا کام کرنے والی کمیٹی کے رکن بھی تھے اور بعد میں انہوں نے اقوام متحدہ میں پاکستان کے متبادل مندوب کے فرائض بھی انجام دیے۔ اس دوران میں ان کی کتاب "روڈ ٹو مکہ" بھی شائع ہو چکی تھی جو ان کے قبول اسلام کی تفصیلی داستان ہے۔ مشہور مسلم سکالر محمد مارماڈیوک پکتھال کی وفات کے کئی سال بعد وہ ماہنامہ "اسلامک کلچر" کے مدیر رہے۔ آخری عمر میں وہ طنجہ (مراکش) اور ساحل اسپین پر جبرالٹر (جبل الطارق) میں مقیم رہے جو تین صدیوں سے برطانیہ کے تسلط میں ہے۔ ان کا ترجمہ و تفسیر قرآن The Message of The Quran کے نام سے 1980ء میں دارالاندلس جبرالٹر سے شائع ہوا۔ انہوں نے بخاری شریف کے کچھ حصے کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا۔ علامہ محمد اسد نے فروری 1992ء میں جبرالٹر میں رحلت فرمائی۔

عرضِ مصنف

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَا نَبِیَّ بَعْدَهٗ!

یہ کتاب نصف صدی قبل، زیادہ صحیح الفاظ میں 1933ء کی خزاں میں لکھی گئی تھی اور پہلی مرتبہ 1934ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔ اس کے بعد لاہور سے بھی چھپی۔ میں نے اس کتاب میں اپنی نسل کے مسلمانوں سے گزارش کی ہے کہ وہ مغربی سماجی اقدار کی اندھی تقلید کو ترک کر دیں اور اس کی بجائے اپنے اسلامی ورثہ کو محفوظ کرنے کی کوشش کریں جس نے کسی زمانہ میں کثیر الجہتی شاندار تاریخی مظہر ''مسلم تہذیب'' کو جنم دیا تھا۔

اسلامی موضوع پر میری اس پہلی کوشش کا غیر منقسم ہندوستان کے انگریزی دان مسلمانوں نے خیر مقدم کیا جس کے بعد اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ چند سال بعد اس کا عربی ترجمہ شائع ہوا۔ اس کا انگریزی کتاب کے مقابلہ میں مشرق وسطیٰ کے تعلیم یافتہ لوگوں پر بہت زیادہ اثر ہوا۔ اس کتاب کی جو پذیرائی ہوئی اس کی وجہ سے دوسرے مسلمان مصنفین نے بھی کتابیں لکھیں جنہوں نے میرا اصل موضوع ''اسلام دوراہے پر'' لے کر اسے مزید پھیلایا۔ ہر مصنف نے اپنے اپنے ذہنی رجحان کے مطابق مختلف شکلوں میں اور مختلف سطحوں پر وہی بات کہنے کی کوشش کی جو میں نے اپنی کتاب میں کہی ہے لیکن انہوں نے اکثر وہ نتائج اخذ نہیں کیے جو میں نے کیے ہیں۔ جن نتائج پر میں اس وقت پہنچا تھا ان پر آج بھی قائم ہوں۔ دوسرے مصنفین کے نتائج میرے نتائج کے بالکل برعکس تھے۔ کتاب لکھتے وقت میرے ذہن میں مسلمانوں میں یہ شعور بیدار کرنا تھا کہ وہ سماجی اور ثقافتی

اعتبار سے انتہائی طاقتور مغربی معاشرہ سے مختلف ہیں۔ اس طرح ان کے فخر میں اضافہ کرنا اور ان میں یہ خواہش پیدا کرنی تھی کہ وہ اپنے روایتی ڈھانچوں اور اداروں کو محفوظ کریں تاکہ بنیادی فرق کا شعور زندہ رہے اور مسلمانوں میں صدیوں سے جو جمود اور ذہنی بانجھ پن موجود ہے اس سے مسلمانوں کو نکال کر اس شعور کو ایک بار پھر ثقافتی طور پر تخلیقی قوت میں ڈھال دیا جائے۔ کتاب میں سارا زور ''احیاء'' اور ''حفاظت'' پر تھا۔ یہ کہ ہمیں ماضی کے ان ڈھانچوں اور اقدار کو محفوظ کرنا ہے جو اب بھی اس حقیقت کے مطابق ہیں کہ اسلام خود ثقافت پیدا کرنے والی قوت ہے اور اسلامی نظریہ کا قرآن و سنت کی روح کے مطابق احیاء کرنے کی ضرورت ہے۔

لیکن ''اسلام دوراہے پر'' لکھتے وقت میرا جو مقصد تھا اس کو بعض مسلمان قارئین اور رہنماؤں نے غلط سمجھا جو میری ثقافتی تخلیقیت کی دعوت کے مضمرات کو پورے طور پر سمجھ نہیں سکے اور یہ سوچنے لگے کہ گزشتہ صدیوں میں مسلمانوں کے زمانۂ زوال کے سماجی ڈھانچوں کی طرف واپسی ہی وقت کی ضرورت ہے۔

میرا جو مدعا تھا یہ سوچ اس کے خلاف تھی۔ مسلم دنیا میں جو احیاء ہوا ہے اور ہو رہا ہے افسوس کہ وہ قرآن و سنت کی حقیقی اقدار کا احیاء نہیں ہے۔ ایک انتشار برپا ہے کیونکہ بہت سے مسلمان اس بات پر آمادہ نظر آتے ہیں کہ قرونِ وسطیٰ میں علماءِ اسلام نے جو سماجی ڈھانچے اور فکر و عمل کی راہیں اختیار کیں ان کو آنکھیں بند کر کے قبول کر لیا جائے حالانکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلام کی اس آئیڈیالوجی کی طرف پوری جرأت سے لوٹ جائیں جو اسلام کے حقیقی ذرائع قرآن و سنت میں آشکار ہے۔

مسلم دنیا میں آج جو المناک انتشار پھیلا ہوا ہے اس کو دور کرنے کے لیے اس کتاب کا نیا اور نظر ثانی شدہ ایڈیشن اس امید پر پیش کر رہا ہوں کہ اس سے آج کے مسلمانوں کو

فائدہ پہنچے گا جیسا کہ 1934ء کے ایڈیشن سے اس زمانہ کے نوجوانوں کو فائدہ پہنچا تھا جو موجودہ مسلمان نسل کے باپ دادا تھے۔ نصف صدی قبل جب یہ کتاب شائع ہوئی تھی، اس کے بعد سے اب تک جو واقعات پیش آ چکے ہیں، ان کی وجہ سے آج کے مسلم نوجوان اس کے معانی اور مطالب کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے اور امید ہے کہ اس کو پسند بھی کریں گے۔ ان کے سامنے آج بھی جو مشکل راستہ ہے یہ کتاب اس میں مددگار ثابت ہوگی۔

طنجہ (مراکش) — محمد اسد
1982ء
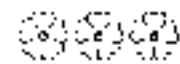
پیش لفظ

انسانیت شاذ ہی ایسے فکری انتشار سے گزری ہے جیسی ہمارے دور سے گزر رہی ہے۔ نہ صرف یہ کہ ہم بے شمار مسائل میں گھرے ہوئے ہیں جن کے لیے نئے اور عدیم النظیر حل کی ضرورت ہے بلکہ یہ مسائل ایسے انداز سے ظاہر ہو رہے ہیں جن سے ہم واقف بھی نہیں۔ ہر ملک میں معاشرہ بنیادی تبدیلیوں سے گزر رہا ہے لیکن ہر جگہ تبدیلی کی رفتار مختلف ہوتی ہے تاہم تبدیلی کے پیچھے ہر جگہ ایک ہی قوت کارفرما ہوتی ہے، یہ قوت ہمیشہ سرگرم عمل رہتی ہے۔

اس اعتبار سے عالم اسلام کی صورت حال مختلف نہیں۔ یہاں بھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ پرانے طور طریقے اور خیالات بتدریج مٹتے چلے جا رہے ہیں اور نئی نئی چیزیں ان کی جگہ لے رہی ہیں جو ان سوالات کو جنم دے رہی ہیں کہ یہ تبدیلی ہمیں کہاں لے جائے گی؟ یہ کتنی گہرائی تک جائے گی؟ یہ اسلام کے ثقافتی مقاصد سے کہاں تک مطابقت رکھتی ہے؟

چونکہ کتاب کا دائرہ محدود ہے اس لیے ان تمام سوالوں کا تفصیلی جواب نہیں دیا گیا صرف اس سوال کو موضوع بحث لایا گیا ہے کہ مسلمانوں کو مغربی تہذیب کے معاملہ میں کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے۔ چونکہ یہ موضوع بہت وسیع ہے اس لیے ہمیں اسلام کے بعض بنیادی پہلوؤں پر بھی بحث کرنا پڑی ہے۔ سنت کا تصور خاص طور پر زیر بحث لایا گیا ہے۔ یہاں اس وسیع موضوع کو نامکمل ہی پیش کیا جا سکتا ہے کیونکہ تفصیل کے لیے کئی ضخیم جلدیں درکار ہوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مختصر خاکہ ایک انتہائی اہم مسئلہ پر غور کرنے کا محرک بنے گا۔

اب کچھ اپنے متعلق۔ کیونکہ جب کوئی شخص اسلام قبول کر لیتا ہے اور مسلم قوم سے کچھ کہنا چاہتا ہے تو مسلمانوں کو یہ جاننے کا حق حاصل ہے کہ اس نے اسلام کیسے اور کیوں

قبول کیا۔

میں نے 1922ء میں اپنے وطن آسٹریا سے یورپ کے بعض ممتاز اخبارات کے نمائندہ خصوصی کی حیثیت سے افریقہ اور ایشیا کا سفر کیا۔ اس کے بعد میں نے تقریباً تمام عمر اسلامی مشرق میں گزاری۔ مجھے جن قوموں سے واسطہ پڑا ان سے شروع میں میری دلچسپی صرف اتنی ہی تھی جتنی کسی غیر ملکی کو ہو سکتی ہے۔ اس دوران میں نے دیکھا کہ وہاں ایک ایسا سماجی ڈھانچہ اور نظریہ زندگی رائج ہے جو یورپ کے نظام سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ مجھے ابتداء ہی میں اس تصور زندگی سے دلچسپی ہوگئی جو یورپ کی تیز رفتار مشینی زندگی کے مقابلہ میں زیادہ پر سکون اور زیادہ انسان دوست تھا۔ اس دلچسپی نے رفتہ رفتہ دونوں نظاموں کے درمیان فرق کے اسباب کی تحقیق کا شوق پیدا کر دیا۔ اس طرح مجھے مسلمانوں کی مذہبی تعلیمات سے دلچسپی ہوگئی۔ اس وقت میری دلچسپی ابھی اتنی گہری نہیں تھی کہ میں حلقہ بگوش اسلام ہو جاتا لیکن اس نے مجھے ایک ترقی پسند انسانی معاشرہ کی نئی دنیا ضرور دکھا دی۔ ایک ایسی دنیا جس میں داخلی کشمکش کم سے کم اور اخوت کے حقیقی جذبات زیادہ سے زیادہ تھے۔ اسلام کی مذہبی تعلیمات نے جن مثالی امکانات کو ظاہر کیا تھا آج کے مسلمانوں کی زندگی ان سے بہت دور ہے۔ اسلام میں ترقی اور حرکت پر زور دیا گیا ہے لیکن آج مسلمان بے عمل اور جامد ہو چکے ہیں۔ اسلام میں فراخ دلی اور ذاتی قربانی کے لیے تیار رہنے پر زور دیا گیا ہے لیکن آج مسلمان تنگ نظر اور آسان زندگی کی محبت میں گرفتار ہو چکے ہیں۔

اس دریافت نے مجھے تحریک دی کہ میں مسلمانوں کی "تب" اور "اب" کی حالت میں فرق کے معمہ کو سلجھاؤں اس لیے میں نے مسئلہ کا زیادہ گہری نظر سے جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اپنے آپ کو اسلام کے دائرہ میں محسوس کرنا شروع کر دیا۔ یہ محض عقلی تجربہ تھا۔ مختصر عرصہ ہی میں یہ معمہ حل ہو گیا۔ مجھ پر منکشف ہوا کہ مسلمانوں کے سماجی اور ثقافتی

زوال کی صرف ایک ہی وجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے رفتہ رفتہ اسلامی تعلیمات پر اس کی روح کے مطابق عمل کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اسلام اب بھی موجود ہے لیکن اس کی روح غائب ہے۔ جس عنصر نے کبھی مسلمانوں کو قوت بہم پہنچائی تھی وہی اب ان کی کمزوری بن چکا ہے۔ ابتداء ہی سے اسلامی معاشرہ صرف مذہبی بنیادوں پر قائم تھا اب یہ بنیادیں کمزور پڑ گئی ہیں جنہوں نے ثقافتی ڈھانچہ بھی کمزور کر دیا ہے اور وہ ثقافتی ڈھانچہ کو منہدم کرنے کا باعث بھی ہو سکتی ہیں۔

اسلامی تعلیمات بالکل واضح اور ہر لحاظ سے قابل عمل ہیں۔ یہ بات جوں جوں میری سمجھ میں آتی گئی اتنا ہی میں اس سوال کے جواب کے لیے بے تاب ہوتا گیا کہ مسلمانوں نے اپنی زندگیوں میں ان تعلیمات پر عمل کرنا کیوں چھوڑ دیا۔ میں نے اس مسئلہ پر صحرائے لیبیا اور پامیر کے درمیان اور آبنائے باسفورس اور بحیرہ عرب کے درمیان واقع بہت سے ممالک کے متعدد مسلمان مفکرین سے گفتگو کی۔ پھر اس سوال کو حل کرنے کا جنون سوار ہو گیا جس کی وجہ سے عالم اسلام میں میری دوسری علمی دلچسپیاں ختم ہو گئیں۔ میں نے ایک غیر مسلم کی حیثیت سے اسلام کے دفاع میں مسلمانوں سے ان کی لاپروائی اور بے حسی پر گفتگو کی۔ میرے اندر جو تبدیلی ہو رہی تھی وہ مجھے از خود محسوس نہیں ہوئی یہاں تک کہ ایک دن 1925ء کی خزاں میں افغانستان کے پہاڑوں میں ایک نوجوان صوبائی گورنر نے مجھ سے کہا "تم مسلمان ہو لیکن تم جانتے نہیں۔" میں یہ الفاظ سن کر ششدر رہ گیا اور کچھ کہہ نہ سکا۔ لیکن جب میں 1926ء میں ایک بار پھر یورپ لوٹا تو مجھے محسوس ہوا کہ میرے رویہ کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ میں اسلام قبول کر لوں۔

یہی وہ حالات تھے جن میں میں مسلمان ہوا۔ اس کے بعد سے مجھ سے بار بار پوچھا گیا "تم نے اسلام کیوں قبول کیا ہے؟ تمہیں کس خاص چیز نے اسلام کی طرف مائل کیا

ہے؟" مجھے اعتراف ہے کہ میرے پاس اس کا کوئی ایک بھی شافی جواب نہیں ہے کیونکہ یہ اسلام کی کوئی خاص تعلیم نہیں جس نے مجھے اس طرف مائل کیا بلکہ یہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات اور زندگی کے جامع لائحہ عمل کے درمیان شاندار ہم آہنگی اور ہم رنگی ہے جس نے مجھے اس طرف راغب کیا ہے۔ اب بھی میں یہ نہیں بتا سکتا کہ اسلام کا کون سا پہلو مجھے دوسرے سے زیادہ اپیل کرتا ہے۔ میرے نزدیک اسلام فن تعمیر کے ایک ایسے مثالی نمونے کی مانند ہے جس کے تمام اجزا ایک دوسرے کے معاون اور ہم رنگ ہیں۔ اس میں نہ کوئی چیز زائد ہے اور نہ کسی چیز کی کمی ہے۔ یہ ایک ٹھوس اور متوازن نظام زندگی ہے۔ غالباً اسی احساس نے کہ اسلامی تعلیمات اور اصولوں میں ہر چیز اپنی اصل اور موزوں جگہ پر ہے' مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی اثرات ہو سکتے ہیں جن کا آج تجزیہ کرنا میرے لیے مشکل ہے۔ آخر کار یہ محبت کا معاملہ تھا..... محبت میں کئی چیزیں شامل ہوتی ہیں: ہماری خواہشات' ہماری تنہائیاں' ہمارے بلند مقاصد اور ہماری خامیاں' ہماری قوتیں اور ہماری کمزوریاں' میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اسلام نے مجھے ایک ڈاکو کی طرح آ لیا جو رات کے وقت کسی گھر میں ڈکیتی کی نیت سے گھستا ہے۔ میرے دل میں بھی اسلام آ گھسا لیکن ڈاکو کی طرح واپس نہیں گیا بلکہ اس نے وہیں بسیرا کر لیا۔

اس کے بعد سے میں نے اسلام کے متعلق زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوشش کی ہے۔ میں نے قرآن و سنت کا مطالعہ کیا' اسلام کی زبان سیکھی اور اس کی تاریخ کا مطالعہ کیا۔ اسلام کے حق میں اور مخالفت میں جو کچھ لکھا گیا ہے [illegible] میں نے چھ سال حجاز اور نجد میں گزارے۔ یہ عرصہ زیادہ تر مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں گزارا تاکہ مجھے ان اصل حالات کا کچھ اندازہ ہو سکے جن میں پیغمبر عربی ﷺ نے اس مذہب کی تبلیغ کی۔ چونکہ حجاز ایسی جگہ ہے جہاں بہت سے ممالک کے مسلمان آتے رہتے ہیں اس لیے میں

اس دور کے عالم اسلام کے مختلف مذہبی اور سماجی نقاط نظر کے موازنہ کے قابل ہوا۔ میرے ان مطالعوں اور موازنوں سے مجھ میں یہ پختہ یقین پیدا ہوا کہ مسلمانوں کی اپنی کوتاہیوں کی پیدا کردہ خرابیوں اور خامیوں کے باوجود اسلام کا روحانی اور سماجی نظام اب بھی انسانیت کے لیے بہت بڑی قوت محرکہ ہے جس کا انسانیت کو کبھی تجربہ ہوا ہے۔ اس لیے میری تمام دلچسپیوں کا محور اسلام کا احیاء بن گیا۔

یہ مختصر کتاب اس عظیم نصب العین کے حصول کے سلسلے میں ایک حقیر خدمت ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ معاملات کا غیر جذباتی سروے ہے بلکہ یہ ایک مقدمہ کا بیان ہے۔ یہ مقدمہ اسلام بنام مغربی تہذیب ہے۔ یہ کتاب ان لوگوں کے لیے نہیں لکھی گئی جن کے نزدیک بہت سے دوسرے سماجی نظاموں کی طرح اسلام بھی ایک سماجی نظام ہے بلکہ یہ ان لوگوں کے لیے ہے جن کے دلوں میں اس شعلہ کی چنگاری ابھی تک موجود ہے جو کسی زمانہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں روشن تھا۔ اس شعلہ نے ایک زمانہ میں سماجی نظام اور ثقافتی کامیابیوں کے ذریعہ سے اسلام کو اتنا عظیم بنا دیا تھا جس کی مثال نہیں ملتی۔

محمد اسد (ایم۔اے)

دہلی مارچ 1934ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(الاحزاب 21/33)

”یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ میں
عمدہ نمونہ (موجود) ہے“

اسلام کی کشادہ شاہراہ

عصر حاضر کا خاص نعرہ ”خلا کی فتح“ ہے۔ اس دور میں مواصلات اور نقل و حمل کے ذرائع اتنی ترقی کر گئے ہیں کہ پچھلی نسلوں میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان ذرائع نے انتہائی سرعت رفتاری سے بڑے پیمانہ پر مال کی منتقلی کو آسان بنا دیا ہے جو تاریخ میں پہلے کبھی انسان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آئی تھی۔ اس کے نتیجہ میں قومیں باہمی انحصار پر مجبور ہو گئی ہیں۔ حالت یہ ہو گئی ہے کہ اب کوئی قوم دنیا سے الگ تھلگ رہنے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اقتصادی ترقی اب کسی ملک اور قوم تک محدود نہیں رہی بلکہ عالمگیر ہو چکی ہے۔ یہ سیاسی سرحدوں اور جغرافیائی فاصلوں کو خاطر میں نہیں لاتی۔ مال کے انتقال سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ افکار اور ثقافتی اقدار کی منتقلی کی ضرورت بڑھتی جا رہی ہے۔ اگرچہ اقتصادی اور ثقافتی اقدار کا انتقال ساتھ ساتھ ہوتا رہتا ہے لیکن انتقال کے طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ اقتصادیات کے ابتدائی قوانین کے مطابق قوموں میں باہمی طور پر مال کا تبادلہ ہونا چاہیے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نہ کوئی قوم صرف خریدار ہو اور نہ کوئی قوم صرف مال فروخت کرنے والی ہو۔ بلکہ ہر قوم کو دونوں کام کرنے چاہئیں یعنی یہ کہ وہ مال خریدے بھی اور فروخت بھی کرے، خواہ یہ کام براہ راست ہو یا معاشی قوتوں کے پیچھے کام کرنے والے عوامل کے ذریعہ سے ہو۔ لیکن ثقافتی میدان میں تبادلہ اس آہنی کلیہ کا محتاج نہیں۔ یہ تبادلہ نظر نہیں آتا، بہ الفاظ دیگر افکار اور ثقافتی اقدار کا تبادلہ ”لو اور دو“ کے اصول پر نہیں ہوتا۔ انسان کی فطرت یہ ہے کہ جو قومیں اور تہذیبیں سیاسی اور اقتصادی طور پر زیادہ توانا ہوتی ہیں وہ کمزور اور کم سرگرم عمل قوموں پر علمی اور سماجی طور پر اثر انداز ہوتی ہیں اور خود ان کا کوئی اثر

www.ebooksland.blogspot.com

قبول نہیں کرتیں۔ آج مغربی دنیا اور مسلم دنیا کے درمیان تعلقات کی نوعیت یہی ہے۔①

مورخ کے نقطۂ نظر سے مسلم دنیا پر مغربی تہذیب کا یک طرفہ اور طاقتور اثر کوئی حیرت کی بات نہیں ہے خواہ مسلم دنیا اس کا اعتراف نہ بھی کرے۔ یہ ایک طویل تاریخی عمل کا نتیجہ ہے جس کی مثالیں دوسری جگہ بھی موجود ہیں۔ مورخین کو چونکہ اپنے مشاہدات سے غرض ہوتی ہے اس لیے ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے مشاہدات سے مطمئن ہوں۔ لیکن مسلمان اس سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ ان کے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ کیا وہ صرف بازار کی رونق ہیں یا اس رونق میں اضافہ کرنے والے ہیں۔ ہم جو پیغمبر محمد ﷺ کے ماننے والے ہیں ان کے لیے درحقیقت مسئلہ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ دوسرے مذاہب کے برعکس اسلام ایسا مذہب نہیں ہے جو مختلف ثقافتی حالات میں خود کو ڈھال لیتا ہے بلکہ اس کا اپنا مکمل ثقافتی اور معاشرتی نظام ہے جس کے خدوخال واضح طور پر متعین ہیں۔ جب کوئی غیر ملکی تہذیب ہمارے اندر اپنی روایات داخل کرتی ہے تو ہمیں اپنے آپ سے یہ سوال کرنا چاہیے کہ کیا یہ غیر ملکی اثر ہماری ثقافت سے مطابقت رکھتا ہے یا اس کے خلاف ہے اور کیا اس کی حقیقت اسلامی ثقافت کے جسد میں تازہ خون کی ہے یا فاسد خون کی۔

اس سوال کا جواب صرف تجربہ ہی سے حاصل ہوسکتا ہے اس لیے ہمیں اسلامی تہذیب وتمدن اور مغربی تہذیب دونوں کے قوائے محرکہ کو دریافت کرنا چاہیے اور یہ تحقیق کرنی چاہیے

① ثقافتی اعتبار سے "خرید و فروخت" اور موجودہ عالم اسلام کے منفی کردار کا یہ تصور بعد میں الجزائر کے ممتاز مصنف مالک بن نبی مرحوم نے آگے بڑھایا جنہوں نے اس حقیقت پر زور دیا جس [illegible] اس کتاب میں پہلی بار کیا گیا تھا کہ کسی زمانہ میں مسلمانوں کو تخلیقی مقام حاصل تھا لیکن اب مسلمان نہ صرف مغربی مال پر مکمل انحصار کر رہے ہیں بلکہ وہ مغربی ٹیکنالوجی اور تنظیمی طریقوں کے محض خریدار بن کر رہ گئے ہیں۔ انہوں نے مغرب کے سماجی اور سیاسی تصورات کو بھی قبول کر لیا ہے [illegible] مغرب کو اپنے مثبت تصورات منتقل نہیں کیے۔

کہ ان میں باہمی تعاون کس حد تک ممکن ہے۔ چونکہ اسلامی تہذیب بنیادی طور پر مذہبی ہے اس لیے ہمیں سب سے پہلے انسانی زندگی میں مذہب کے عمومی کردار کو متعین کرنا چاہیے۔

ہم جس کو مذہبی رویہ کہتے ہیں وہ انسان کی عقلی اور حیاتیاتی ساخت کا فطری نتیجہ ہے۔ انسان خود زندگی کے اسرار پر سے پردہ نہیں اٹھا سکتا۔ انسان حیات و ممات لامحدودیت اور ابدیت کی گتھیاں نہیں سلجھا سکتا کیونکہ ان پر ایسا پردہ پڑا ہوا ہے جو اٹھائے نہیں اٹھتا۔ اس کی عقل ناقابل تسخیر دیواروں سے سر پٹکنے کی سعی نامشکور کرتی رہتی ہے۔ انسان صرف دو کام کر سکتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ زندگی کا کلی احاطہ کرنے اور اس کو سمجھنے کی کوشش ترک کر دے۔ ایسی صورت میں اسے صرف خارجی شواہد پر انحصار کرنا پڑے گا اور وہ اپنے نتائج کو خارجی تجربات کے دائرے میں محدود رکھے گا۔ اس طرح وہ زندگی کے الگ الگ اجزاء کو سمجھ سکے گا جو عددی اور توضیحی لحاظ سے اتنی ہی تیزی یا آہستگی سے بڑھ سکتے ہیں جتنی تیزی یا آہستگی سے فطرت کے بارے میں انسانی علم بڑھتا ہے مگر وہ ہمیشہ اجزاء ہی رہیں گے اور زندگی کا کلی احاطہ کرنا اور اس کا سمجھنا اس کی سرحد ادراک سے پرے ہی رہے گا۔ قدرتی علوم کے اسرار اسی طرح کھلتے ہیں۔ دوسرا امکان مذہب کا راستہ ہے۔ یہ راستہ سائنسی طریقے کی راہ میں رکاوٹ پیدا نہیں کرتا۔ مذہب کا راستہ انسان کے اندرونی زیادہ تر وجدانی تجربہ کی روشنی میں زندگی کی یک گونہ توجیہ اس تصور کے ساتھ قبول کرنے پر آمادہ کرتا ہے کہ کائنات کا ایک خالق اعلیٰ ہے جو اس کا مدبر بھی ہے اور اس نے اس کی تقدیر رقم کردی ہے اور ایک طے شدہ منصوبے کے مطابق اس کائنات کو چلا رہا ہے۔ خالق کی یہ اسکیم انسانی فہم سے بالاتر ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ تصور انسان کو زندگی کے ایسے حقائق اور اجزاء کی تحقیق سے روکتا نہیں جو خود کو خارجی مشاہدے کے لیے پیش کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خارجی (سائنسی) اور داخلی (مذہبی) تصورات باہم متصادم نہیں

لیکن ہم صرف مذہبی تصور کے ذریعہ ہی سے یہ سمجھ سکتے ہیں۔ کہ زندگی تمام تر جوہر اور قوت محرکہ کی ایک وحدت ہے اور اس کے مختلف عناصر میں توازن اور "ہم آہنگی" ہے۔ ہم آہنگی کا لفظ اکثر غلط استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ زیر بحث مسئلہ میں وہ بڑی اہمیت رکھتا ہے اس لیے اس کی وضاحت ضروری ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے رویوں میں ہم آہنگی ہونی چاہیے۔ مذہبی انسان جانتا ہے کہ اس پر جو کچھ گزرتی ہے اور اس کے اندر جو تغیر ہوتا رہتا ہے وہ کسی اندھی بہری طاقتوں کی کارفرمائی نہیں جو کوئی شعور نہ رکھتی ہوں اور نہ وہ کسی مقصد سے آشنا ہوں بلکہ جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ کی مشیت کے تحت ہوتا ہے اور یہ سب کچھ کائنات کی تقدیر کا ایک حصہ ہے۔ اس طرح انسان اپنی ذات اور حقائق و شواہد کی معروضی دنیا یعنی قدرت کے درمیان تضاد و تناقض کو دور کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ انسان کو اپنی روح کی تمام پیچیدگیوں' نفس کی خواہشات اور خوف' اپنے احساسات اور غیر یقینی قیاسات کے ساتھ ایک فطرت سے واسطہ پڑا ہے جس میں نعمت و قسمت' خطرہ اور سلامتی حیران کن اور ناقابل توجیہ طریقے سے ملے جلے ہیں اور انسانی ذہن کی ساخت اور اس کے سوچنے کا انداز بظاہر فطرت کے طریق کار سے یکسر مختلف ہے اور اس اختلاف کو نہ تو عقل اور نہ تجرباتی سائنس کے ذریعہ سے دور کیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں مذہب داخل ہوتا ہے۔

مذہبی تصورات اور تجربات کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی خود آگاہ خودی اور ایک خاموش اور بظاہر غیر ذمہ دار فطرت میں روحانی ہم آہنگی پائی جاتی ہے کیونکہ انسان کا شعور اور فطرت جو اس کے چاروں طرف اور اس کے اندر موجود ہے' دونوں مختلف ہوتے ہوئے بھی خالق کائنات کی مشیت کے مربوط مظاہر ہیں۔ مذہب کا انسان کو جو فوری فائدہ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے اندر یہ احساس اجاگر ہوتا ہے کہ وہ ازل سے ابد تک جاری

رہنے والے تخلیقی عمل کی ایک منظم اکائی ہے۔ بہ الفاظ دیگر وہ کائنات کے لامحدود وجود کا ایک متعین حصہ ہے جو خالق نے اس کے لیے مقدر کیا ہے۔ اس تصور کے نفسیاتی نتیجے میں انسان کے اندر روحانی سلامتی کا گہرا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح امید و بیم کی کیفیات میں اعتدال پیدا ہوتا ہے جو مذہبی انسان کو خواہ اس کا کوئی بھی مذہب ہو' ان لوگوں سے ممیز کرتا ہے جن کا کوئی بھی مذہب نہ ہو۔

تمام عظیم مذاہب میں' خواہ ان کے اصول کچھ بھی ہوں' یہ قدر مشترک ہے کہ وہ انسان کے اخلاقی وجود کا تصور رکھتے ہیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اللہ کی مرضی کے آگے سر جھکا دے۔ لیکن اسلام اس تصور سے بھی آگے کی بات کرتا ہے اور ہمیں سکھاتا ہے کہ زندگی ایک وحدت ہے کیونکہ یہ ایک معبودِ حقیقی کی تخلیق ہے۔ مزید برآں یہ ہمیں وہ عملی راستہ بھی دکھاتا ہے جس پر چل کر ہر شخص اپنی انفرادی ارضی زندگی کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے وجود اور اپنے شعور دونوں میں خیال اور عمل کی وحدت پیدا کر سکتا ہے۔ اس اعلیٰ نصب العین کے حصول کے لیے اسلام ہمیں ترک دنیا پر مجبور نہیں کرتا اور نہ روحانی تزکیہ کے لیے کسی خفیہ دروازے کو کھولنے کے لیے ریاضتوں پر مجبور کرتا ہے۔ اسلام نجات کے لیے انسانی ذہن پر ناقابل فہم باتوں پر یقین کرنے کے لیے دباؤ نہیں ڈالتا۔ اس قسم کے مطالبات کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ اسلام کا کوئی جوگیانہ فلسفہ نہیں بلکہ اسلام تو قوانین فطرت کے مطابق زندگی گزارنے کا لائحہ عمل بتاتا ہے جس کا حکم خالق نے اپنی مخلوق کو دیا ہے۔ انسان کی تخلیق اور اس کی کامیابیوں کا نقطہ کمال یہ ہے کہ اس کے روحانی اور مادی پہلوؤں میں مکمل ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔ اسلام نے انسان کے جسمانی وجود اور اس کے اخلاقی وجود کے درمیان کشمکش کو ختم کر دیا ہے بلکہ اسلام کا اصرار ہے کہ ان دونوں وجودوں کا ایک دوسرے سے پیوستہ اور ہم آہنگ رہنا ہی زندگی کی فطری بنیاد ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ نماز کی خاص شکل کی وجہ یہی ہے کہ اس میں جسمانی افعال اور روحانی ارتکاز کا امتزاج پیدا کر دیا گیا ہے۔ اسلام کے مخالفین نماز کے طریقہ کو خاص طور پر ہدف تنقید بناتے ہیں اور اس کو اپنے اس الزام کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں کہ اسلام رسوم و رواج اور ظاہرداری کا مذہب ہے۔ ان کے الزام کی حقیقت یہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے پیرو جسم اور روح کو الگ الگ رکھ کر دیکھتے ہیں۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی گوالا دودھ سے بالائی کو الگ کر دے۔ ان کی سمجھ میں آسانی سے یہ بات نہیں آسکتی کہ اسلام کے دودھ میں جس کی بالائی اتاری نہ گئی ہو، یہ دونوں اجزا اپنی اپنی امتیازی ساخت کے باوجود ہم رنگ اور ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں نماز میں ذہنی حضوری اور جسمانی افعال دونوں ہی شامل ہوتے ہیں کیونکہ انسانی زندگی بھی ان دونوں سے مرکب ہے اور ہم اللہ کے حضور میں اپنی تمام صلاحیتوں اور قوتوں کے لیے جوابدہ ہیں جو اللہ نے ہمیں عطا کی ہیں۔

اس کی مزید وضاحت خانہ کعبہ کے طواف سے ہو سکتی ہے۔ جو شخص مکہ معظمہ جاتا ہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ خانہ کعبہ کا طواف کرے۔ حاجیوں کے تین مناسک میں طواف بھی شامل ہے۔ ہم یہ سوال کر سکتے ہیں کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی عقیدت کا اظہار ایک رسمی طریقہ سے کریں؟ جواب بالکل واضح ہے۔ اگر ہم کسی چیز کے چاروں طرف چکر لگائیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ چیز ہمارے عمل کا مرکزی نقطہ ہے۔ کعبہ جس کی طرف منہ کر کے ہر مسلمان نماز پڑھتا ہے اللہ کی وحدانیت کی علامت ہے۔ اسی طرح حج کے موقع پر کعبہ کا طواف یہ ظاہر کرتا ہے کہ نہ صرف ہمارے عقیدت مندانہ افکار بلکہ ہماری عملی زندگی، ہمارے افعال اور کوششوں کے مرکز میں اللہ اور اس کی وحدانیت کا تصور جاگزیں ہونا چاہیے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝ ﴾

(الذاریات: ۵۱/ ۵۶)

''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو محض اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ صرف میری ہی عبادت کریں۔''

اس طرح دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں اسلام میں عبادت کا مفہوم مختلف ہے کیونکہ یہاں عبادت صرف روحانی مشق نہیں جیسے نماز یا روزہ، بلکہ عبادت انسان کی پوری عملی زندگی پر محیط ہے۔ اگر ہماری تمام تر زندگی کا مقصد اللہ کی عبادت ہے تو ہمیں اپنی زندگی کو ہر لحاظ سے ایک ہمہ گیر اخلاقی ذمہ داری سمجھنا چاہیے۔ اس طرح ہمارے تمام اعمال کی حیثیت، خواہ وہ کتنے ہی معمولی کیوں نہ ہوں، عبادت کی ہو جاتی ہے۔ اس لیے ہمیں یہ تمام اعمال شعوری طور پر سمجھ کر انجام دینے چاہئیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے کائناتی منصوبے کا حصہ ہیں۔ یہ معاملات اوسط درجہ کی صلاحیت رکھنے والوں کے لیے دور از کار آئیڈیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن کیا مذہب کا مدعا یہ نہیں ہے کہ آئیڈیلز کو حقیقی روپ دیا جائے؟

اس معاملہ میں اسلام کی پوزیشن بالکل واضح ہے۔ وہ ہمیں پہلا سبق یہ دیتا ہے کہ انسان اپنی زندگی کے ہر دائرہ اور شعبہ میں اللہ کی عبادت کرے اور یہی مقصد زندگی ہے۔ اور دوسرا یہ کہ زندگی کو دو حصوں مادہ اور روح میں تقسیم کر کے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ مادہ اور روح کو ایک ہم رنگ وحدت میں منسلک کر کے ہی ہم اس مقصد کو حاصل کر سکتے ہیں۔ اللہ کی وحدانیت کا اظہار زندگی کے مختلف پہلوؤں میں مطابقت اور وحدت پیدا کر کے ہی ہو سکتا ہے۔

اس کے منطقی نتیجہ میں اسلام اور دوسرے مذاہب میں فرق مزید واضح ہو جاتا ہے۔ یہ فرق اس حقیقت سے بھی عیاں ہوتا ہے کہ اسلام اللہ اور انسان کے درمیان صرف روحانی تعلقات ہی کو واضح نہیں کرتا بلکہ وہ انسان اور اس کے سماجی ماحول کے درمیان دنیاوی

تعلقات کو بھی واضح کرتا ہے۔ دنیاوی زندگی صرف خالی چھلکا اور آخرت کا بے معنی سایہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک مثبت وحدت ہے۔ اللہ تعالیٰ خود بھی ایک وحدت ہے، نہ صرف جوہر ذات میں بلکہ مقصد میں بھی، اس لیے اللہ تعالیٰ کی تخلیق بھی ایک وحدت ہے جو نہ صرف جوہر بلکہ مقصد کے اعتبار سے بھی یقیناً ایک وحدت ہے۔

ذات باری کی معرفت اسلام کے مطابق انسانی زندگی کی تفہیم سے عبارت ہے۔ اور یہ معرفت ہی ہے جس کے ذریعہ انسان دنیاوی زندگی میں تکمیل کے درجہ تک پہنچ سکتا ہے۔ تمام مذاہب میں سے صرف اسلام ہی یہ بتاتا ہے کہ دنیاوی زندگی میں فرد کی تکمیل ممکن ہے۔ اسلام عیسائیت کی طرح اپنی حیوانی خواہشات کو کچلنے پر زور نہیں دیتا اور نہ ہندوؤں کی طرح آواگون کی بات کرتا ہے اور نہ بدھ مت کی طرح یہ کہتا ہے کہ انسان کی نجات اور تکمیل کا انحصار اپنی ذات، اپنی خواہشات اور دنیا سے جذباتی تعلقات کو کچلنے پر ہے بلکہ اسلام یہ کہتا ہے کہ انسان دنیاوی زندگی میں اپنی تمام فطری صلاحیتوں اور قوتوں کو بروئے کار لا کر تکمیل کے درجہ تک پہنچ سکتا ہے۔

غلط فہمی دور کرنے کے لیے تکمیل کی اصطلاح کی وضاحت بہت ضروری ہے۔ انسان چونکہ حیاتیاتی طور پر ایک محدود مخلوق ہے اس لیے ہم "مطلق" تکمیل کی بات نہیں کر سکتے کیونکہ مطلق کے دائرے میں صرف صفات الٰہی آتی ہیں۔ اس لیے نفسیاتی اور اخلاقی اعتبار سے انسان کی تکمیل تقابلی بنیاد پر اور بہت محدود معنی میں ہوگی۔ اس سے ہرگز یہ مراد نہیں ہو سکتی کہ تمام اچھی صفات اس میں موجود ہوں اور نہ یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ دنیا کی نت نئی خوبیوں کو وہ اپنے اندر آہستہ آہستہ جذب کرتا چلا جائے بلکہ اس سے صرف یہ مراد ہے کہ انسان کے اندر جو مثبت صفات موجود ہیں ان کو اس طرح ترقی دے کہ اس کے اندر کی تمام قوتیں اور صلاحیتیں بیدار ہو جائیں۔ زندگی کی رنگا رنگی کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر

انسان کو دوسرے سے مختلف قوتیں اور صلاحیتیں ودیعت کی ہیں اس لیے یہ خیال کرنا فضول ہوگا کہ ہر شخص ایک ہی نوعیت کی تکمیل حاصل کر سکے گا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ گھڑ دوڑ کے گھوڑے اور صحرائی گھوڑے دونوں انفرادی طور پر کامل ہونے کے باوجود اپنی بعض بنیادی خوبیوں کی بنا پر مختلف ہو سکتے ہیں۔ عیسائیت کے نزدیک راہب اور سینٹ بن جانا انسان کی تکمیل ہے۔ اگر اس معیار کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر انسان کو اپنی انفرادیت کو ترک کرنا، تبدیل کرنا یا دبانا پڑے گا۔ لیکن یہ اللہ تعالیٰ کے قانون کی خلاف ورزی ہوگی کیونکہ اس نے ہر فرد کو الگ الگ انسان بنایا ہے۔ اسی لیے دنیا میں رنگا رنگی اور بوقلمونی کا راج ہے اور اسی لیے اسلام جو خواہشات اور جذبات کو کچلنے کا مذہب نہیں، ہر انسان کو اس کے ذاتی اور سماجی وجود کے لیے ایک وسیع میدان عمل مہیا کرتا ہے تاکہ وہ اپنی صفات، مزاج اور نفسیاتی رجحانات اور صلاحیتوں کے مطابق ترقی کر سکے۔

پس ایک انسان خواہ وہ راہب ہو یا قانونی دائرہ میں اپنی تمام نفسانی خواہشات سے لطف اندوز ہوتا ہو، خواہ وہ خانہ بدوش ہو اور صحراؤں میں گھومتا رہتا ہو جس کے پاس کل کے لیے کھانے کو کچھ نہ ہو یا دولت مند سوداگر ہو جو مال و دولت سے کھیلتا ہو، اگر وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کی پیروی کرتا ہے تو پھر وہ اپنی فطرت کی رہنمائی میں اپنی ذاتی زندگی کو اپنی مرضی کے مطابق گزارنے میں آزاد ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کا بہترین استعمال کرے تاکہ اس کے خالق نے اسے جو نعمتیں عطا کی ہیں ان کا شکر ادا ہو۔ مزید برآں وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں یعنی صلاحیتوں کو انسانوں کی روحانی، سماجی اور مادی مدد کے لیے بروئے کار لائے۔ لیکن زندگی میں وہ کونسا راستہ اختیار کرے گا اس کا کوئی پیمانہ مقرر نہیں کیا گیا۔ اس کے سامنے بے شمار جائز راستے کھلے ہوئے ہیں، وہ ان میں سے کسی کو بھی اختیار کرنے میں آزاد ہے۔ اسلام میں اس آزادی کی بنیاد یہ ہے کہ انسان فطرتاً

نیک ہے۔ عیسائیت کا تصور یہ ہے کہ انسان پیدائشی گناہ گار ہے۔ ہندومت کی تعلیمات کے مطابق انسان ذلیل اور ناپاک ہے اس کو تکمیل یا نجات کے لیے "آواگون" کے نہ ختم ہونے والے سلسلے کی سختیوں سے گزرنا ہوگا۔ اس کے برعکس اسلامی تعلیمات کے مطابق انسان معصوم پیدا ہوتا ہے اور اس معنی میں انسان بالقوہ کامل ہے جس کی وضاحت اوپر کی گئی ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝ ﴾ (التین: ۹۵/ ۴)

"ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔" اس کے ساتھ ہی یہ فرمایا:

﴿ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ﴾

(التین: ۹۵/ ۵-۶)

"پھر ہم نے اس کو انتہائی پستی میں دھکیل دیا سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے۔"

ان آیات میں یہ اصول بیان کیا گیا ہے کہ انسان شروع میں نیک اور معصوم تھا لیکن اللہ پر ایمان نہ رکھنے اور نیک اعمال انجام نہ دینے کے باعث اس کی فطری تکمیل برباد ہو سکتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں انسان اپنی انفرادی حیثیت میں تکمیل تک پہنچ سکتا ہے بشرطیکہ وہ شعوری طور پر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان رکھے اور اس کے قوانین کے آگے سر تسلیم خم کردے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اسلام کے نزدیک انسان برا نہیں اور پیدائشی طور پر اس میں برائی موجود نہیں بلکہ وہ برائی اپنی شعوری زندگی میں خود اختیار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو پیدائشی مثبت صلاحیتیں عطا کی ہیں ان کے غلط استعمال سے شر پیدا ہوتا ہے۔ یہ صلاحیتیں ہر شخص میں مختلف ہوتی ہیں اور یہ بالقوہ مکمل ہوتی ہیں۔ ان کی پوری طرح نشوونما دنیاوی زندگی کے عرصے میں ممکن ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ اخروی زندگی میں جب ہمارے احساسات اور تصورات بالکل تبدیل ہو جائیں گے ہمیں نئی قوتیں اور صلاحیتیں عطا

ہوں گی جس کی وجہ سے انسانی روح کو مزید نشوونما دینا ممکن ہو جائے گا۔ اگرچہ اس کا تعلق اخروی زندگی سے ہے لیکن دنیاوی زندگی میں بھی ہر انسان اپنی مثبت صلاحیتوں اور رجحانات کو ترقی دے کر اپنی شخصیت کی تکمیل کر سکتا ہے۔

تمام مذاہب میں سے صرف اسلام ہی انسان کے لیے یہ ممکن بناتا ہے کہ وہ اپنی روحانیت کو قربان کیے بغیر دنیاوی زندگی سے لطف اندوز ہو سکے۔ یہ عیسائیت کے تصور سے یکسر مختلف ہے! عیسائیت کے مطابق انسان پر آدم وحوا علیہما السلام کا گناہ چپک گیا ہے جس کے نتیجہ میں انسان کی ساری زندگی مصائب سے بھر گئی ہے۔ عیسائیت کے نزدیک دنیا دو مختلف طاقتوں خیر وشر کی کشمکش کا اکھاڑہ ہے۔ شر کی نمائندگی شیطان کرتا ہے اور خیر کی نمائندگی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کرتے ہیں۔ شیطان حیوانی خواہشات کو انگیخت کر کے انسانی روح کی ابدیت کی طرف پیش قدمی میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ روح کا تعلق عیسیٰ علیہ السلام سے ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسانی جسم شیطان کی آماجگاہ ہے۔ اس کو ان الفاظ میں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ مادہ کی دنیا بنیادی طور پر شیطان کی دنیا ہے جبکہ روح کی دنیا "خدا" کی دنیا اور نیکی ہے۔ عیسائی دینیات کے مطابق انسان کی فطرت میں ہر مادی خواہش ہوس ہے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ آدم علیہ السلام نے شیطان کا مشورہ مان لیا تھا۔ اس لیے انسان کو اپنی نجات کے لیے اس دنیا میں دل نہیں لگانا چاہیے بلکہ روحانی دنیا میں لگانا چاہیے جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سولی پر چڑھ کر آدم علیہ السلام کے گناہ کا کفارہ ادا کیا۔

اگرچہ عملی زندگی میں اس مسیحی نظریہ پر کبھی عمل نہیں ہوتا لیکن ان تعلیمات کی موجودگی میں مذہبی انسان میں یہ احساس مستقل رہتا ہے کہ اس کا ضمیر برا ہے۔ اس طرح انسان دو خواہشوں کی کشمکش کا شکار رہتا ہے۔ ایک یہ کہ دنیا کو ترک کر دیا جائے اور دوسری یہ فطری خواہش کہ دنیا کی لذتوں سے لطف اندوز ہوا جائے۔ آدم علیہ السلام کا یہ مبینہ گناہ جس سے بچنا

www.ebooksland.blogspot.com

ممکن نہیں اور اس کے کفارہ کے طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا سولی پر چڑھنا جو عام انسانوں کے لیے ناقابل فہم ہے' ان کا تصور ہی انسان کی روحانی ترقی اور اس کی جائز دنیوی خواہشات کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دیتا ہے۔

اسلام میں اس "ابتدائی گناہ" کا کوئی تصور نہیں ہے۔ یہ تصور اللہ تعالیٰ کے عدل کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی بچے کو اس کے والدین کے اعمال کا ذمہ دار نہیں ٹھہراتا تو پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ ان گنت نسل در نسل انسانوں کو اس گناہ کا ذمہ دار قرار دے گا جو ان کے پہلے باپ سے مبینہ طور پر سرزد ہوا تھا؟ اس عجیب و غریب تصور کی فلسفیانہ توجیہ بھی ممکن نہیں۔ اس کی جو بھی توجیہ کی جائے وہ عقل کے نزدیک مصنوعی اور غیر تسلی بخش ہی رہے گی۔ اسی طرح تثلیث کے فلسفہ کی بھی عقلی توجیہ ممکن نہیں۔ چونکہ اسلامی تعلیمات میں باپ دادا کے گناہ کا کوئی تصور نہیں ہے اس لیے انسان کو اس کا کفارہ ادا کرنا نہیں پڑے گا۔ گناہ اور توبہ انسان کا انفرادی فعل ہے۔ ہر مسلمان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ روحانی کامیابی اور ناکامی کا احساس اس کے اپنے دل میں ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں بتایا گیا ہے:

﴿ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ﴾ (البقرۃ: ۲/ ۲۸۶)

"اچھے اعمال اس کے حق میں جائیں گے اور برے اعمال اس کے خلاف۔"

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿ وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ۝٣٩ ﴾ (النجم: ۵۳/ ۳۹)

"اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔"

اسلام اگرچہ سینٹ پال کی عیسائیت میں بیان کردہ زندگی کے تاریک نقطہ نظر کو نہیں مانتا لیکن وہ ہمیں سکھاتا ہے کہ ہم دنیاوی زندگی سے وہ باتیں منسوب نہ کریں جنہیں جدید مغربی تہذیب اس سے منسوب کرتی ہے۔ مسیحیت دنیاوی زندگی کو برائی گردانتی ہے جبکہ جدید مغرب مسیحیت سے جداگانہ سوچ رکھتا ہے کہ دنیا میں کھاؤ پیو اور عیش کرو۔ ایسا انسان

کھانے پینے کی ہر چیز کو ہڑپ تو کرتا رہتا ہے لیکن اسے ان چیزوں کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ اسکے برعکس اسلام انسان کی دنیوی زندگی کی قدر تو کرتا ہے لیکن اسکو معبود نہیں بناتا بلکہ دنیوی زندگی کو ارفع زندگی کی راہ کا حیاتیاتی مرحلہ قرار دیتا ہے۔ چونکہ یہ ایک مرحلہ ہے جو بہت ضروری ہے اس لیے اسلام دنیوی زندگی سے نہ تو نفرت کرتا ہے اور نہ اس کی ناقدری کرتا ہے۔ ہمارا دنیاوی سفر اللہ تعالیٰ کی اسکیم کا ایک ضروری اور مثبت حصہ ہے' اس لیے انسانی زندگی انتہائی قدر و قیمت کی حامل ہے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ زندگی ایک ذریعہ ہے۔ اسلام میں جدید مغرب کی اس مادی رجائیت کیلئے کوئی جگہ نہیں جو یہ کہتا ہے: "میری سلطنت صرف یہی دنیا ہے۔" اور نہ اسلام عیسائیت کے اس تصور کا حامی ہے کہ "میری سلطنت اس دنیا کی نہیں ہے۔" اسلام درمیانی راستہ اختیار کرتا ہے۔ اسلام ہمیں یہ دعا سکھاتا ہے:

﴿ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً ﴾

(البقرۃ: ۲/ ۲۰۱)

"اے ہمارے رب! اس دنیا میں بھی ہمیں بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی بھلائی دے۔"

اس لیے اس دنیا سے تمتع حاصل کرنا ہماری روحانی ترقی میں مانع نہیں۔ مادی خوشحالی اگرچہ بذات خود نصب العین نہیں ہے لیکن یہ پسندیدہ ضرور ہے۔ ہماری عملی سرگرمیوں کا مقصد ہمیشہ یہ ہونا چاہیے کہ ایسا انفرادی اور سماجی ماحول پیدا کیا جائے اور اس کو برقرار بھی رکھا جائے جو انسان کی اخلاقی ترقی کیلئے سازگار ہو۔ اس اصول کی روشنی میں اسلام انسان پر اخلاقی ذمہ داریاں عائد کرتا ہے۔ ہمارا ہر عمل خواہ چھوٹا ہو یا بڑا' اخلاقی دائرہ میں ہونا ضروری ہے۔ انجیل کا مشہور مقولہ ہے: "جو کچھ قیصر کا ہے وہ اسے دو اور جو کچھ خدا کا ہے وہ اسے دو۔" اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ اسلام ہمیں سکھاتا ہے کہ ہر چیز کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اور اسلام ہماری سماجی' اقتصادی اور اخلاقی زندگی کے مابین کسی قسم کی کشمکش کو نہیں مانتا۔ ہر

www.ebooksland.blogspot.com

معاملہ میں انتخاب صرف ایک ہی ہو سکتا ہے: حق یا باطل۔ ان کے درمیان کوئی چیز نہیں ہے۔ اس لیے نیک اعمال پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے جو اخلاقیات کا لازمی جزو ہے۔

ہر مسلمان کے چاروں طرف جو کچھ ہو رہا ہے کسی حد تک وہ بھی اس کا ذمہ دار ہے، اس لیے اس کو ہر میدان میں حق کے قیام اور باطل کو مٹانے کی جدوجہد کرنی چاہیے۔ یہی بات قرآن مجید کی اس آیت میں بیان کی گئی ہے:

﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ﴾ (آل عمران: ۳/ ۱۱۰)

"جتنی امتیں لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان میں سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو۔"

اسلام کی جارحانہ سرگرمیوں کا یہی اخلاقی جواز ہے اور اسلام کی ابتدائی فتوحات اور مبینہ توسیع پسندی کی یہی دلیل ہے۔ اگر کوئی شخص توسیع پسندی کا لفظ استعمال کرنے پر اصرار کرتا ہے تو دنیائے اسلام بعض اوقات یقیناً وسعت پذیر رہی، مگر اس توسیع کا محرک غلبہ حاصل کرنا نہیں تھا۔ اس کا مقصد اقتصادی خوشحالی یا قومی تفاخر یا مسلمانوں کے عیش و آرام کے لیے دوسروں کے مال و دولت کو بزور طاقت چھیننا بھی نہیں تھا۔ نہ کبھی اس کا مقصد غیر مسلموں کو زبردستی اسلام میں داخل کرنا تھا بلکہ اس کا مقصد، جو آج بھی ہے، ایسا ماحول پیدا کرنا تھا جس میں بہترین طریقے سے انسان کی روحانی نشوونما ہو سکے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق علم اخلاق از خود پابندیاں عائد کرتا ہے۔ صرف نظری طور پر حق و باطل کے فرق کو جان لینے کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ جان لینے کا مدعا حق کا قیام اور باطل کو مٹانا ہے۔ یہ بذات خود بڑی ذمہ داری ہے کیونکہ دنیا پر اپنا غلبہ قائم کرنے ہی سے اخلاقیات زندہ رہتی ہے ورنہ مر جاتی ہے۔

مغرب کی روح

پچھلے باب میں اسلام کی اخلاقی بنیاد کا خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی تہذیب تاریخ میں مذہبی ریاست کی مکمل ترین شکل تھی۔ ②

اسلام میں روحانی معاملات سب پر فوقیت رکھتے ہیں، باقی تمام چیزیں انہی کے تحت ہوتی ہیں۔ اگر ہم اس کا مغربی تہذیب سے موازنہ کریں تو ان میں بہت بڑا فرق نظر آئے گا۔

جدید مغرب کی تمام سرگرمیوں اور کاوشوں کا محور عملی افادیت اور حرکی ارتقاء ہے۔ ان کا اصلی مقصد زندگی کی صلاحیتوں کو دریافت کرنے کے لیے تجربات کرنا ہے۔ اس معاملہ میں وہ کسی اخلاقیات کو نہیں جانتے۔ جدید یورپیوں یا امریکیوں کے نزدیک اس کی عملاً کوئی حیثیت نہیں ہے کہ زندگی کیا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے۔ ان کے نزدیک اہمیت اس سوال کی ہے کہ زندگی کیا کیا شکلیں اختیار کر سکتی ہے اور کیا نسل انسانی اس کائنات کا آقا بننے کی طرف پیش رفت کر رہی ہے؟ جدید یورپی و امریکی اس آخری سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں لیکن مسلمان اس پر یقین نہیں رکھتے۔ قرآن مجید میں آدم علیہ السلام اور اس کی نسل کے متعلق بتایا گیا ہے:

② میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میں تھیوکریسی (مذہبی ریاست) کا لفظ ان معنوں میں استعمال نہیں کر رہا ہوں جن معنوں میں مغرب میں عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اپنے تاریخی تجربات کی روشنی میں مغرب مذہبی ریاست سے مراد کلیسا کے سیاسی اختیارات لیتا ہے یعنی قرون وسطیٰ کے کرسچن چرچ اور پادریوں کے سیاسی اختیارات۔ اس کے مقابلہ میں اسلام پاپائیت کو تسلیم نہیں کرتا اور نہ اسلام میں کرسچن چرچ کا کوئی ادارہ ہو سکتا ہے، چنانچہ جب ہم مسلمان تھیوکریسی کی بات کرتے ہیں تو وہ اس کا سماجی اور سیاسی ڈھانچہ ہے جس میں قوانین شریعت کے مطابق بنائے جاتے ہیں۔ (اس سلسلہ میں میری کتاب "اسلام میں ریاست اور حکومت کے اصول" The Principles of State and Government in Islam) کے باب "اصطلاحات اور تاریخی نظیر" کا مطالعہ کیا جائے۔)

﴿ إِنِّي جَاعِلٌ فِي ٱلْأَرْضِ خَلِيفَةً ﴾ (البقرۃ: ۲/ ۳۰)

''میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔''③

اس سے صاف ظاہر ہے کہ انسان کے لیے زمین پر حکومت کرنا اور ترقی کرنا مقدر کر دیا گیا ہے۔ لیکن ترقی کی نوعیت کیا ہو؟ اس پر اسلام اور مغربی نقطۂ نظر میں بڑا فرق ہے۔ جدید مغرب کا کہنا ہے کہ اخلاقی اور سماجی ترقی اجتماعی ہونی چاہیے جو عملی کامیابیوں اور سائنسی انداز فکر سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر مغرب کے مادہ پرستانہ حرکی تصور کے بالکل برعکس ہے۔ اسلام اجتماعی ''انسانیت'' کے روحانی امکانات کو سکونی مقدار قرار دیتا ہے جو انسان کی فطرت کے اندر ودیعت کر دی گئی ہے۔ اسلام مغرب کی طرح اس کو طے شدہ امر نہیں سمجھتا کہ انسانی فطرت اجتماعی طور پر تبدیلی یا ارتقاء کی طرف بڑھ رہی ہے جیسا کہ درخت پروان چڑھتا ہے۔ اسلام کا کہنا ہے کہ انسانی فطرت کوئی حیاتیاتی چیز نہیں ہے۔ جدید مغربی فکر کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ مادی علوم اور عیش و تنعم کو اخلاقی ترقی کا ہم معنی سمجھتا ہے۔ یہ وہی غلطی ہے کہ حیاتیاتی اصولوں کو غیر حیاتیاتی حقائق پر منطبق کیا جائے۔ دراصل جدید مغرب روح کی موجودگی پر یقین نہیں رکھتا۔ اسلام آسمانی مذہب ہے وہ روح کو ایک حقیقت کے طور پر بیان کرتا ہے جس میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ اگرچہ مادی ترقی اور روحانی ترقی آپس میں متصادم نہیں ہیں لیکن یہ دونوں ایک چیز بھی نہیں ہیں۔ یہ انسانی زندگی کے واضح طور پر دو مختلف پہلو ہیں اور ان کی ترقی کے لیے ایک دوسرے پر انحصار ضروری نہیں۔ یہ الگ الگ بھی اگرچہ ہمیشہ نہیں ترقی کر سکتے ہیں۔

اسلام اگرچہ انسانیت کی اجتماعی مادی ترقی کو پسند کرتا ہے لیکن اسلام کے نزدیک

③ قرآن مجید کی اس آیت کی تشریح کے لیے محمد اسد کے ترجمہ وتفسیر The Message of The Qu'ran کے صفحہ 8 پر نوٹ نمبر 22 دیکھیے۔

انسانیت کی روحانی ترقی اجتماعی معاملہ نہیں جو اجتماعی کامیابیوں کا ذریعہ بن سکے بلکہ یہ انسان کا انفرادی معاملہ ہے اور ہر فرد کی روحانی اور اخلاقی ترقی کا خم وار خط اس کی پیدائش سے موت تک ممکنہ طور پر اونچا یا نیچا ہوتا رہتا ہے۔ ہم اجتماعی طور پر تکمیل کی طرف نہیں بڑھ سکتے لہٰذا ہر شخص کو انفرادی طور پر روحانی نصب العین کے حصول کے لیے کوشاں رہنا چاہیے۔ اس کی ابتدا اور انتہا کا وہ خود ہی ذمہ دار ہے۔

انسان کی روحانی تقدیر کے انفرادی نقطۂ نظر کو معاشرہ اور سماجی تعلقات کے طاقتور اسلامی نظریے نے متوازن بنا دیا ہے اور بالواسطہ طور پر اس کی توثیق بھی کر دی ہے۔ اسلامی معاشرہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ افراد کی خارجی زندگی کے لیے سازگار ماحول مہیا کرے جس میں روحانی ترقی کی راہ میں کم سے کم رکاوٹیں ہوں اور حوصلہ افزائی کے زیادہ سے زیادہ مواقع ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی شریعت انسان کی مادی زندگی اور روحانی زندگی دونوں کے لیے رہنمائی فراہم کرتی ہے' مزید برآں اس کی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں کے لیے بھی رہنمائی دیتی ہے۔

جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں' یہ تصور اس پختہ یقین پر قائم رہ سکتا ہے کہ انسان کے اندر روح موجود ہے اور اس کی زندگی میں ایک روحانی مقصد کارفرما ہے لیکن یورپ اور امریکہ کے موجودہ نظریے کے مطابق روح نام کی کوئی چیز نہیں ہے' البتہ وہ بعض صورتوں میں روح کو نیم دلی سے تسلیم کرتے ہیں۔ اس نظریے کے مطابق انسانی زندگی کا عملاً کوئی مقصد نہیں رہ جاتا' اس لیے مغرب نے تمام ماورائے عقل قیاسات اور تصورات سے پیچھا چھڑا لیا ہے۔

ہم جس کو ''مذہبی رویہ'' کہتے ہیں اس کی بنیاد ہمارا یہ ازلی یقین ہے کہ ایک جامع آسمانی اخلاقی قانون موجود ہے اور انسانوں کو اس قانون کی لازماً پابندی کرنی چاہیے لیکن

جدید مغربی تہذیب اس کو تسلیم نہیں کرتی کہ انسان اقتصادی، سماجی اور قومی مفادات کے سوا کسی اور کو معبود بنا لے۔ مغرب کا حقیقی معبود روحانی نوعیت کا نہیں بلکہ عیش و تنعم ہے۔ اور اس کی زندگی کا حقیقی فلسفہ طاقت کی خاطر طاقت کا حصول ہے۔ یہ دونوں نظریے قدیم رومی تہذیب سے ورثہ میں ملے ہیں۔

رومی تہذیب کو کسی حد تک جدید مغرب کی مادہ پرستی کی فلسفیانہ بنیاد قرار دینا ان لوگوں کو عجیب لگے گا جنہوں نے قدیم رومی سلطنت اور قدیم اسلامی سلطنت کے موازنہ کی بات بارہا سنی ہوگی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر اسلام اور جدید مغرب کے بنیادی تصورات میں اتنا بڑا فرق کیوں ہے جبکہ ماضی میں دونوں کے سیاسی انداز ایک جیسے تھے؟ صاف جواب یہ ہے کہ یہ دونوں ایک جیسے نہیں تھے۔ جدید مغربی نسل کے ذہنوں میں اس قسم کی تاریخی غلط بیانیاں اور سطحی نیم معلومات بھر دی گئی ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اسلامی اور رومی سلطنتوں کے درمیان کوئی چیز مشترک نہیں ہے سوائے اس کے کہ وسیع علاقوں میں جن میں مختلف قسم کے لوگ بستے تھے ان کی حکومت تھی لیکن یہ دونوں حکومتیں دو مختلف قوت محرکہ رکھتی تھیں، دوران کے تاریخی مقاصد بھی مختلف تھے۔ ارتقائی پہلو سے بھی دیکھیں تو دونوں میں بڑا فرق نظر آئے گا۔ رومی سلطنت کو جغرافیائی طور پر پروان چڑھنے اور سیاسی بلوغت تک پہنچنے کے لیے ایک ہزار سال لگے جبکہ اسلامی سلطنت صرف 80 برس میں اپنے شباب پر آ گئی۔ ان کے زوال کو دیکھا جائے تو فرق اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ رومی سلطنت کا زوال جس پر ہنوں اور گوتھوں ○ نے آخری مہر ثبت کی، صرف ایک صدی میں مکمل

○ ہن وسطی ایشیا سے ابھرنے والا خانہ بدوش نسلی گروہ تھے جنہوں نے اٹیلا (433-53ء) کی قیادت میں یورپ کو روند ڈالا تھا اور گوتھ (قوطی) قدیم جرمانی قبیلے تھے جنہوں نے تیسری صدی عیسوی کے بعد اٹلی، جنوبی فرانس اور سپین میں سلطنتیں قائم کیں۔ سپین (اندلس) میں وزی گوتھ (مغربی قوطی) حکمرانوں سے اقتدار چھیننے والے عالم بردار طارق بن زیاد نے شکست دے کر اسلامی تمدن کی بنیاد رکھی۔ (ادارہ)

ہو گیا۔ یہ زوال اتنا مکمل تھا کہ ادب اور تعمیرات کے سوا اس کا نام و نشان تک نہ رہا۔ بازنطینی سلطنت جو عام طور پر روم کی براہ راست وارث سمجھی جاتی ہے، رومی سلطنت کے کچھ علاقوں پر ضرور حکومت کرتی رہی لیکن اس کے سماجی اور سیاسی ڈھانچوں کا رومی سیاست کے تصورات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ○ اس کے برعکس اسلامی سلطنت جو خلافت کہلاتی ہے، اس کے طویل دور میں بلاشبہ بعض تبدیلیاں ہوئیں اور مختلف خاندانوں کی حکومتیں قائم ہوئیں لیکن اس کے ریاستی ڈھانچہ میں تبدیلی نہیں ہوئی۔ جہاں تک بیرونی حملوں کا تعلق ہے منگول بھی، جو رومی سلطنت کو ملیامیٹ کرنے والے ہنوں اور گوتھوں سے زیادہ خونخوار تھے، خلافت کے سماجی ڈھانچہ کو ہلا نہ سکے اور نہ اس کے سیاسی وجود کو ختم کر سکے، البتہ وہ بعد کے زمانہ میں اس کے اقتصادی اور علمی زوال کا باعث ضرور ہوئے۔ اس کے برعکس رومی سلطنت ایک صدی میں تباہ ہو گئی۔ خلافت آہستہ آہستہ زوال پذیر ہوئی جس میں ایک ہزار سال لگے یہاں تک کہ عثمانی خلافت کے خاتمے کے ساتھ ہی اس کا سیاسی ڈھانچہ تباہ ہو گیا، جس کے بعد سماجی ڈھانچے کی تباہی کے آثار نظر آئے جس کا مشاہدہ ہم آج کر رہے ہیں۔

اس سے ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہیں کہ عالم اسلام کی اندرونی طاقت اور اس کا سماجی ڈھانچہ اتنا طاقتور تھا کہ انسانی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ چینی تہذیب کا بھی اس سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا جس نے کئی صدیوں تک جارحیت کی مزاحمت کرنے کی صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ چین ایک براعظم کے سرے پر واقع ہے۔ وہ نصف صدی پہلے یعنی جدید جاپان کے ابھرنے تک کسی مخالف طاقت کی دسترس میں نہیں تھا۔ چنگیز خان اور اس کے جانشین

○ 395ء میں رومی سلطنت دو ٹکڑوں میں بٹ گئی تھی۔ مغربی رومی سلطنت (395-476ء) کا دارالحکومت روم تھا جبکہ مشرقی رومی سلطنت (395-1453ء) جس کا دارالحکومت قسطنطنیہ تھا اس شہر کے قدیم نام بازنطیم کی نسبت سے عموماً بازنطینی سلطنت کہلاتی ہے جسے قرآن مجید میں الروم کہا گیا ہے۔ (ادارہ)

منگولوں کے زمانہ میں جنگیں چینی سلطنت کے حاشیے پر لڑی گئیں لیکن اسلامی سلطنت جو تین براعظموں تک پھیلی ہوئی تھی ہر وقت خاصے طاقتور دشمنوں سے گھری رہی۔ مشرق وسطیٰ اور مشرق قریب کی سرزمین نسلی اور ثقافتی تہذیبوں کے تصادم کا اکھاڑہ بنی رہی لیکن اسلامی سماجی ڈھانچہ قابل تسخیر رہا' البتہ حالیہ زمانہ میں اس کو نقصان پہنچا ہے۔ ہمیں اس حیرت انگیز واقعہ کا جواز تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ قرآنی تعلیمات نے ایک عظیم سماجی ڈھانچہ کے لیے ٹھوس بنیاد فراہم کی اور پیغمبر محمد ﷺ نے اس کے گرد بنیان مرصوص استوار کر دی۔ رومی سلطنت میں اس قسم کا کوئی روحانی عنصر موجود نہیں تھا جو سلطنت کو جوڑے رکھتا اس لیے وہ اتنی جلدی مٹ گئی۔

ان دو قدیم سلطنتوں کے درمیان ایک اور فرق بھی ہے۔ اسلامی سلطنت میں کوئی مراعات یافتہ قوم نہیں تھی اور اقتدار کا مقصد دین کی ترویج و اشاعت تھا۔ یہ ارفع مقصد اس دین کے لانے والے اور اس کے علمبرداروں نے واضح کیا تھا جبکہ رومی سلطنت کا مقصد ملکوں پر فتح حاصل کرنا اور اپنے ملک کے فائدہ کے لیے دوسری قوموں کا استحصال کرنا تھا۔ مراعات یافتہ لوگوں کی پرتعیش زندگی کے لیے رومیوں کے نزدیک بڑے سے بڑا ظلم اور بڑی سے بڑی ناانصافی بھی روا تھی۔ رومی انصاف جس کا بڑا شہرہ ہے صرف رومیوں کے لیے تھا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا رویہ زندگی اور تہذیب کے صرف مادی تصورات ہی پر مبنی ہو سکتا ہے۔ اس مادہ پرستی کو علمی اور جمالیاتی ذوق نے یقیناً بہتر بنا دیا تھا لیکن اس میں روحانی اقدار کا کوئی دخل نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ رومیوں کو مذہب کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ ان کے روایتی دیوتا یونانی دیو مالا کی بھونڈی نقل تھے جن کو خاموشی سے سماجی روایت کے مطابق ڈھال لیا گیا تھا۔ کسی بھی صورت میں ان دیوتاؤں کو "حقیقی" زندگی میں مداخلت کی اجازت نہیں تھی۔ جب ان سے رجوع کیا جاتا تو پروہتوں کے ذریعہ سے ان کی غیبی آواز

ملتی تھی لیکن ان سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ انسانوں پر اخلاقی قوانین نافذ کریں گے اور ان کی رہنمائی کریں گے۔

یہ وہ مٹی ہے جس سے جدید مغربی تہذیب نے جنم لیا۔ بلاشبہ اس تہذیب نے اپنی ترقی کے دور میں مختلف اثرات قبول کیے اور اس نے رومیوں کے ثقافتی ورثے میں ایک سے زائد طریقوں سے تبدیلیاں کیں۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ مغربی اخلاقیات میں آج جو کچھ صحیح سمجھا جاتا ہے وہ براہ راست رومی تہذیب کا اثر ہے۔ قدیم روم کا علمی اور سماجی ماحول محض مادہ پرستی اور مذہب دشمنی پر مبنی تھا۔ یہی ماحول آج بھی جدید مغرب میں موجود ہے خواہ اس کا سرعام اعتراف نہ بھی کیا جائے۔ آسمانی مذہب کے خلاف کوئی ثبوت نہ رکھتے ہوئے اور ایسے ثبوت کی ضرورت تسلیم نہ کرتے ہوئے بھی جدید مغربی فکر اگرچہ مذہب کو سماجی روایت کے طور پر تو برداشت کرتی ہے لیکن وہ آسمانی اخلاقیات کا عملی زندگی سے کوئی تعلق روا نہیں رکھتی۔ مغربی تہذیب صاف طور پر "اللہ" کا انکار تو نہیں کرتی لیکن اس کے یہاں موجودہ ذہنی و عقلی ماحول میں "اللہ" کی جگہ نہیں اور نہ اس تہذیب کو "اللہ" کو ماننے کا کوئی فائدہ نظر آتا ہے۔ انسان زندگی کا مجموعی طور پر احاطہ نہیں کر سکتا اور مغربی تہذیب نے اس کی عقلی مشکل میں سے خیر کا ایک پہلو دریافت کر لیا ہے لہٰذا جدید مغرب میں صرف اس تصور کی عملی اہمیت ہے جو تجرباتی سائنس کے دائرہ میں آتا ہے یا وہ اس تصور کی اہمیت کو تسلیم کرتی ہے جو انسان کے سماجی تعلقات کو عملی طور پر متاثر کرتا ہو۔ چونکہ بادی النظر میں ان دونوں صورتوں میں "اللہ" کے وجود کا سوال پیدا نہیں ہوتا' اس لیے اصولی طور پر مغربی ذہن عملی زندگی سے "اللہ" کو خارج کرنے پر راغب ہے۔

سوال یہ ہے کہ عیسائیت کے طرز فکر سے یہ رویہ کیسے مطابقت رکھتا ہے۔ کیا عیسائیت جو مغربی تہذیب کا روحانی سرچشمہ سمجھی جاتی ہے؟ سماجی اخلاقیات پر مبنی نہیں؟ یقیناً یہ آسمانی

اخلاقیات پر مبنی ہے تو پھر اس سے بڑی اور کوئی غلطی نہیں ہو سکتی کہ یہ کہا جائے کہ مغربی تہذیب نے عیسائیت سے جنم لیا ہے۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے' جدید مغرب کی عقلی بنیاد قدیم روم کے اس تصور پر ہے کہ زندگی صرف مادی ہے' اس کا کسی آسمانی ہدایت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے: "چونکہ ہم یقین سے کچھ نہیں جانتے کہ انسانی زندگی کی ابتدا کیسے ہوئی اور مرنے کے بعد کیا ہوگا' سائنسی تجربات اور ریاضیات سے بھی اس کو معلوم نہیں کیا جا سکتا' اس لیے بہتر یہی ہے کہ اپنی تمام توانائیاں مادی اور عقلی ترقی پر صرف کی جائیں اور اس معاملہ میں آسمانی اخلاقیات یا اخلاقی مفروضوں کو مزاحم ہونے نہ دیا جائے کیونکہ ان اخلاقیات کا کوئی سائنسی ثبوت نہیں ہے۔" اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ عذر جو جدید مغربی تہذیب کی اساس ہے' عیسائیت' اسلام یا کسی اور مذہب کے لیے ناقابل قبول ہے کیونکہ یہ اپنی اصل میں لامذہبیت ہے۔ اس لیے یہ کہنا مضحکہ خیز ہے کہ جدید مغربی تہذیب کی عملی کامیابیاں عیسائی تعلیمات کا ثمر ہیں۔ عیسائیت نے سائنسی اور مادی ترقی میں کوئی حصہ نہیں لیا جس میں مغرب کی موجودہ تہذیب نے کمال حاصل کر لیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ کامیابیاں عیسائی کلیسا اور اس کے نظریہ زندگی کے خلاف یورپ کی صدیوں کی جنگ کے نتیجہ میں حاصل ہوئیں۔

کئی صدیوں تک یورپ کی روح کو مذہبی نظام کے ذریعہ سے کچلا جاتا رہا۔ اس نظام میں انسانی فطرت کو حقارت سے دیکھا جاتا تھا۔ عیسائیت میں رہبانیت' باطل کے سامنے سر جھکا دینا' ایک گال پر کوئی طمانچہ مارے تو دوسرا گال پیش کر دینا' جنس کو شجر ممنوعہ قرار دینا' یہ تمام تصورات جنت سے آدم و حوا علیہما السلام کے نکلنے سے وابستہ ہیں' یعنی باپ کا پہلا گناہ اور کفارہ کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا سولی پر چڑھنا۔ ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کی تعبیر مثبت نہیں ہے بلکہ اس کو ناگزیر برائی سمجھا جاتا ہے اور روحانی ترقی کے لیے سخت ترین

ریاضتوں کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ مادی علوم اور دنیوی زندگی کو بہتر بنانے کی کوششوں میں مزاحم ہے۔ بلاشبہ طویل عرصہ تک یورپ کی عقل و دانش زندگی کے اسی تاریک تصور کی غلام رہی ہے۔ قرون وسطیٰ میں کلیسا مختار کل تھا اور یورپ کا سائنسی ریسرچ میں کوئی کردار نہیں تھا۔ اس کا روم اور یونان کے فلسفیانہ خیالات سے بھی کوئی واسطہ نہیں رہ گیا تھا جس سے یورپی ثقافت نے جنم لیا ہے۔ کلیسا نے عقل کے دیو کو زنجیروں سے باندھ رکھا تھا جس کے خلاف انسانی عقل نے بار بار بغاوت کی لیکن کلیسا نے اس کو مار مار کر اپنا تابع مہمل بنائے رکھا۔ قرون وسطیٰ کی تاریخ یورپ کی عقل و خرد اور کلیسا کی جکڑ بندیوں کے درمیان کشمکش سے بھری ہوئی ہے۔

عیسائی کلیسا کی فکری زنجیروں سے یورپی خرد کو نشاۃ ثانیہ کے موقع پر آزادی نصیب ہوئی۔ اس کی وجہ بڑی حد تک عربوں کی ثقافت اور ان کے افکار کے اثرات تھے جو کئی صدیوں سے مغرب پر پڑ رہے تھے۔

قدیم یونان اور اس کے بعد کی یونانی ثقافت کے اچھے پہلوؤں کو عربوں نے اختیار کر لیا تھا اور ابتدائی اسلامی سلطنت کے قیام کے بعد صدیوں میں ان کو ترقی دی۔ میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یونانی افکار کو قبول کرنے کا عربوں اور مسلمانوں کو فائدہ ہوا۔ میرے نزدیک اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اسلامی افکار اور قانون کو ارسطاطالیسی اور نوافلاطونی تصورات کے احیاء سے متعارف کرانے میں مسلمانوں کو جو بھی مشکلات پیش آئیں لیکن اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اس نے یورپی افکار کو زبردست تحریک دی۔ قرون وسطیٰ میں یورپ میں پیداواری قوتوں کو استعمال نہیں کیا گیا' اس دور میں علوم جامد رہے' توہم پرستی کا رواج رہا۔ سماجی زندگی اتنی خام تھی کہ اس کا آج تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس مرحلہ پر عالم اسلام کی ثقافتی یلغار شروع ہوئی۔ سب سے پہلے مشرق میں صلیبیوں کی جنگی مہمات کے اثرات'

مغرب میں مسلم اسپین اور سسلی میں شاندار علمی کامیابیوں اور بعد ازاں مشرق قریب سے جنیوا اور وینس کی جمہوریاؤں کے بڑھتے ہوئے تجارتی تعلقات نے یورپی تہذیب کے بند دروازوں پر دستک دینی شروع کر دی۔ یورپی دانشوروں اور مفکروں کے سامنے ایک اور تہذیب نمودار ہوئی جس نے ان کی نگاہیں خیرہ کر دیں، جو بڑی مہذب، ترقی کی راہ پر رواں دواں، پرجوش زندگی سے بھرپور اور ثقافتی دولت سے مالا مال تھی اور جس کو یورپ بہت پہلے کھو چکا تھا اور بھول بھی چکا تھا۔ عربوں نے جو کچھ کیا وہ یہ تھا کہ انہوں نے قدیم یونانی علوم کو زندہ کر دیا، اپنی نئی سائنسی دنیا پیدا کی اور تحقیق اور فلسفہ کی نئی راہیں دریافت کیں اور انہیں مختلف راستوں سے مغربی دنیا میں منتقل کیا۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ ہم آج جس سائنسی دنیا میں رہ رہے ہیں اس نے عیسائی یورپ میں آنکھ نہیں کھولی بلکہ وہ دمشق، بغداد، قاہرہ، قرطبہ، نیشاپور اور سمرقند کے اسلامی مراکز میں پیدا ہوئی۔

اسلامی تہذیب کے یورپ پر بڑے گہرے اثرات پڑے۔ اس سے مغرب کے آسمانوں پر نئی روشنی ہویدا ہوئی جس نے مغرب میں نئی روح پھونک دی اور ترقی کی تڑپ پیدا کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ یورپی مورخین نے اس کو احیائے علوم یا نشاۃ ثانیہ (Renaissance) یعنی نیا جنم قرار دیا۔ دراصل یہ یورپ کا نیا جنم ہی تھا۔

اسلامی ثقافت سے کئی طاقتور اور جاندار لہریں پیدا ہوئیں جنہوں نے یورپ کے بہترین دماغوں کو عیسائی کلیسا کے تباہ کن غلبے کی مضبوط زنجیروں کو توڑنے کے لیے نئی قوت فراہم کی۔ اس کشمکش کا آغاز اصلاحی تحریکوں کی صورت میں ہوا جو بیک وقت مختلف یورپی ملکوں میں شروع ہوئیں جن کا مقصد یہ تھا کہ عیسائی طرز فکر کو زندگی کے نئے تقاضوں کے مطابق ڈھالا جائے۔ یہ تحریکیں بڑی جاندار تھیں۔ اگر انہیں صحیح معنوں میں روحانی کامیابی حاصل ہو جاتی تو یہ پورے یورپ میں سائنس اور مذہبی فکر کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے

کا باعث بن جاتیں لیکن قرون وسطیٰ میں کلیسا نے جو نقصان پہنچا دیا تھا وہ اتنا گہرا اور ہمہ گیر تھا کہ اس کو محض اصلاح سے پورا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مزید برآں ان تحریکوں کے اندر بہت جلد مفاد پرست گروہوں کے مابین سیاسی کشمکش شروع ہو گئی۔ بجائے اس کے کہ ان سے عیسائیت کی اصلاح ہوتی، یہ جلد ہی دفاعی رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئیں اور رفتہ رفتہ ان کا رویہ معذرت خواہانہ ہو گیا۔ کلیسا نے، خواہ کیتھولک ہو یا پروٹسٹنٹ، اپنی ذہنی شعبدہ بازی، اپنے ناقابل فہم عقائد، دنیا سے اپنی نفرت اور مظلوم عوام کے کندھوں پر سوار ہو کر اقتدار حاصل کرنے والوں کی بے جا حمایت ترک نہیں کی بلکہ اس نے اپنے کھوکھلے دلائل کے ساتھ ان برائیوں کی وکالت کرنے کی کوشش کی۔ یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں ہے کہ عشرے اور صدیاں گزرنے کے ساتھ ساتھ یورپ میں مذہبی افکار کی گرفت کمزور سے کمزور ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ اٹھارھویں صدی کے انقلاب فرانس کا سیلاب کلیسا کی برتری کو بہا کر لے گیا۔ اس کے ساتھ ہی کلیسا کے سماجی اور سیاسی تصورات بھی یورپ کے مختلف ملکوں میں انقلاب کی نذر ہو گئے۔

اس وقت ایک مرتبہ پھر یہ ظاہر ہوا کہ قرون وسطیٰ کی کلامی دینیات کے مردہ ہاتھوں سے نجات حاصل کر کے ایک نئی احیاء یافتہ تہذیب ابھر رہی ہے جس کا یورپ منتظر تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کی ابتدا میں فلسفہ، آرٹ، ادب اور سائنس کے شعبوں میں یورپ میں بعض بہترین اور روحانی طور پر بڑی طاقتور شخصیات پیدا ہوئیں لیکن روحانی زندگی کا حقیقی مذہبی تصور صرف چند افراد تک ہی محدود رہا۔ یورپ کے عوام جو طویل عرصہ سے مذہبی عقائد کے اسیر تھے اور جن کا انسان کی فطری کاوشوں سے کوئی تعلق نہیں رہ گیا تھا، اپنی رہائی کے بعد بھی مذہب کے صحیح تصور سے آشنا نہیں ہو سکے۔

یورپ میں مذہب کے احیاء کی راہ میں رکاوٹ بننے والا سب سے اہم عقلی عنصر یہ

www.ebooksland.blogspot.com

تصور تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام "خدا" کے بیٹے ہیں۔ فلسفیانہ ذہن رکھنے والے عیسائیوں نے اس تصور کو کبھی اس کے لغوی معنی میں نہیں لیا۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت انسانی شکل میں ظاہر ہوئی تھی لیکن بدقسمتی سے ہر شخص فلسفیانہ ذہن نہیں رکھتا' اس لیے عیسائیوں کے سواد اعظم نے "بیٹا" کے معنی بیٹا ہی لیے اگرچہ ہمیشہ اس کو صوفیانہ رنگ بھی دیا گیا اور کہا گیا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو "خدا" کا بیٹا کہنے کے معنی خود "خدا" کے ہیں جس نے سفید ڈاڑھی والے ایک مہربان بوڑھے شخص کی صورت اختیار کر لی تھی۔ انتہائی فنکارانہ مہارت سے بنائی گئیں اس کی بے شمار پینٹنگز موجود ہیں جو یورپ کے لاشعوری ذہن پر منقش ہو گئی ہیں۔

جس زمانہ میں یورپ میں عیسائی عقیدہ کا راج تھا اس وقت اس عجیب وغریب تصور کو چیلنج کرنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن ایک مرتبہ جب قرون وسطیٰ کی عقلی زنجیریں ٹوٹ گئیں تو غور وفکر کرنے والے یورپی انسانی شکل میں "خدا" کے زمین پر آنے کے تصور کو ہضم نہیں کر سکے۔ دوسری طرف "بشریت سے خدائی تک" کا عقیدہ خدا کے مقبول عام تصور کا نمایاں جزو بن چکا تھا۔ کلیسا کی تعلیمات میں "خدا" کا جو تصور پیش کیا گیا ہے' نیا یورپی فکر اس کو ماننے سے انکاری ہو گیا۔ چونکہ وہ "خدا" کے کسی اور تصور سے واقف نہ تھا' اس لیے اس نے "خدا" ہی کی نفی کر دی اور ساتھ ہی مذہب کا بھی منکر ہو گیا۔

دیار مغرب کے رہنے والوں میں صنعتی اور دیگر شاندار مادی ترقیوں نے نئی دلچسپیاں پیدا کر دیں جس سے مغرب میں مذہبی خلا پیدا ہو گیا۔ اس خلا میں مغربی تہذیب نے خطرناک موڑ اختیار کر لیا۔ یہ ہر اس شخص کے نقطہ نظر سے المیہ تھا جو مذہب کو انسانی زندگی کی مضبوط ترین حقیقت مانتا ہے۔ عیسائیت کی تثلیث کی اسیری سے رہائی حاصل کرنے کے بعد یورپی ذہن تمام حدود پھلانگ گیا اور رفتہ رفتہ انسان کی روحانی زندگی کی سوچ بھی مخالفت کے گرداب میں پھنس گیا۔ روحانی اقدار کی مدعی طاقتوں کا جو خوف لاشعور میں

بیٹھ گیا تھا' اس کے ردعمل کی وجہ سے یورپ اصولی اور عملی طور پر مذہب کی مخالف قوتوں کا چیمپئن بن گیا۔ اس طرح وہ اپنے اصل رومی ورثہ کی طرف لوٹ گیا۔

کسی کو اس موقف پر مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا کہ یہ دوسرے مذاہب پر عیسائی عقیدہ کی امکانی برتری نہیں تھی جس نے مغرب کو شاندار مادی کامیابیاں حاصل کرنے کے قابل بنایا کیونکہ ان کامیابیوں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اگر یورپ کی عقلی طاقتوں نے عیسائی کلیسا کے بنیادی اصولوں کے خلاف تاریخی جدوجہد نہ کی ہوتی۔ یورپ کا موجودہ مادہ پرستانہ تصور زندگی عیسائیت کی "روحانیت" کے خلاف ایک انتقام ہے کیونکہ عیسائیت کی روحانیت کا انسانی زندگی کی فطری سچائیوں سے کوئی واسطہ نہیں رہا تھا۔

یہ ہمارے دائرہ میں نہیں آتا کہ عیسائیت اور جدید مغربی تہذیب کے تعلقات کا گہرائی میں جا کر جائزہ لیا جائے۔ میں نے صرف تین بڑے غالباً بنیادی اسباب کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے کہ جدید مغربی تہذیب اپنے تصورات اور طور طریقوں سے مکمل طور پر مذہب کے خلاف کیوں ہے۔ پہلا سبب یہ ہے کہ یہ تہذیب رومی تہذیب کا ورثہ ہے جس کا انسانی زندگی اور اس کی فطری اقدار کے متعلق رویہ خالص مادہ پرستانہ تھا۔ دوسرا سبب عیسائیت کے خلاف انسانی فطرت کی بغاوت ہے جبکہ عیسائیت انسان کی فطری خواہشات سے نفرت کرتی اور ان کے حصول کی جدوجہد کوششوں کو کچلتی رہی ہے (اس مقصد کے لیے سیاسی اور اقتصادی قوتوں کے لیڈروں کے ساتھ عیسائیت کا روایتی گٹھ جوڑ رہا ہے اور وہ صاحبان اقتدار کے استحصالی اور ظالمانہ ہتھکنڈوں کی حمایت کرتی رہی ہے) تیسرا سبب یہ تصور ہے کہ "خدا" انسان کی شکل میں دنیا میں آیا۔

مذہب کے خلاف بغاوت کامیاب رہی۔ یہ اتنی کامیاب ہوئی کہ عیسائیوں کے مختلف فرقے اور کلیسا مجبور ہو گئے کہ وہ یورپ کے سماجی اور ذہنی حالات کے مطابق اپنے اصولوں

www.ebooksland.blogspot.com

میں بتدریج تبدیلیاں کریں۔ مذہب کا بنیادی کام اپنے ماننے والوں کی اجتماعی زندگی پر اثر انداز ہونا اور اس کو تبدیل کرنا ہوتا ہے لیکن عیسائیت نے سیاست کا نقاب اوڑھ کر نئی روایات کو برداشت کرنا شروع کر دیا۔ اس لیے عوام کے نزدیک مذہب کے معنی فقط ظاہری رسوم و رواج رہ گئے جیسا کہ قدیم روم کے دیوتاؤں کے ساتھ ہوا تھا جن کو معاشرہ پر کسی قسم کا اثر ڈالنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اب بھی مغرب میں بہت سے ایسے افراد موجود ہیں جو صحیح مذہبی انداز فکر رکھتے ہیں۔ وہ لوگ یہ ثابت کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں کہ ان کے عقائد ان کی تہذیب کی روح کے مطابق ہیں لیکن ایسے لوگ استثناء کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کا ایک عام آدمی' خواہ وہ جمہوری ہو یا فاشسٹ' سرمایہ دار ہو یا کیمونسٹ' مزدور ہو یا دانشور' صرف ایک مثبت ''مذہب'' یعنی مادی ترقی کو جانتا ہے۔ اب یہ عقیدہ بن چکا ہے کہ انسان کا نصب العین زندگی کو آسان تر اور زیادہ آرام دہ بنانا ہے جس کو ''قدرت سے آزادی'' کے نام سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس مذہب کے متعدد بڑے بڑے کارخانے' سینما' کیمیاوی لیبارٹریاں' رقص گاہیں اور ہائیڈرو الیکٹرک ورکس ہیں اور اس کے پادری موسیقار' انجینئر' فلم اسٹار' صنعتکار اور بڑے بڑے کھلاڑی ہیں۔ اقتدار اور لذت کے حصول کی اس شدید خواہش کا لازمی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ باہم حریف گروہ بھی پیدا ہو گئے ہیں جو پوری طرح مسلح ہیں اور اس پر تلے بیٹھے ہیں کہ جب ان کے مفادات کا ٹکراؤ ہو تو وہ ایک دوسرے کو نیست و نابود کر دیں۔ ○ ثقافتی اعتبار سے اس کے نتیجہ میں ایک ایسا انسان وجود میں آ گیا ہے جس کی اخلاقیات صرف عملی افادیت تک محدود ہو کر رہ گئی ہے اور

○ یورپ کی استعماری طاقتیں برطانیہ و فرانس پہلی جنگ عظیم (18-1914ء) میں جرمنی سے ٹکرائی تھیں اور 1930ء کی دہائی میں نازی جرمنی اپنی سابقہ شکست کا انتقام لینے کے لیے دوبارہ اپنی فوجی طاقت بڑھا رہا تھا جس کے نتیجے میں دوسری جنگ عظیم (45-1939ء) برپا ہوئی۔ (ادارہ)

اس کا خیر و شر کا اعلیٰ ترین معیار مادی کامیابی ہے۔

اس وقت مغرب کی سماجی زندگی میں جو زبردست تبدیلی ہو رہی ہے' اس میں یہ اخلاقیت جڑ پکڑتی جا رہی ہے کہ جو کچھ مفاد عامہ میں ہے وہی ٹھیک ہے' اس لیے معاشرہ کی مادی خوشحالی پر براہ راست اثر انداز ہونے والی اقدار مثلاً فنی مہارت' حب الوطنی اور قوم پرستی کو مبالغہ آمیز طور پر فروغ دیا جا رہا ہے جبکہ وہ تمام اقدار جن کی خالص اخلاقی بنیاد تھی' مثلاً اولاد کی محبت یا جنسی وفاداری' تیزی سے اپنی اہمیت کھو رہی ہیں کیونکہ ان سے معاشرہ کو کوئی مادی فائدہ نہیں پہنچتا۔ کسی دور میں گروہ یا قبیلہ کی فلاح و بہبود کے لیے مضبوط خاندانی رشتوں کو فیصلہ کن حیثیت حاصل تھی' اب ان کی جگہ اجتماعی ادارے لے رہے ہیں جن کی بہت سی شاخیں ہیں اور معاشرہ بنیادی طور پر فنی معاشرہ بن چکا ہے اور اس کو تیزی سے مشینی خطوط پر استوار کیا جا رہا ہے۔ اس میں بیٹے کے باپ کے ساتھ رویہ کی کوئی خاص سماجی اہمیت نہیں ہے۔ جب تک کہ باپ بیٹا معاشرہ کی معروف حدود کو نہ پھلانگیں اور اس معروف کے اندر رہتے ہوئے آپس میں میل برتیں' اس وقت تک معاشرہ ان سے تعرض نہیں کرتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مغربی باپ کا روز بروز اپنے بیٹے پر اختیار کمزور پڑتا جا رہا ہے اور بیٹا باپ کو عزت و احترام سے محروم کرتا جا رہا ہے۔ اس طرح باپ بیٹے کے روایتی تعلقات آہستہ آہستہ ختم ہوتے جا رہے ہیں جنہیں عملاً مشینی معاشرہ کے تصورات نے زور زکار بنا دیا ہے کیونکہ اس معاشرہ میں فرد پر فرد کے اختیارات ختم کرنے کا رجحان ہے۔ اس تصور کا منطقی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ خاندان کے افراد اپنی خاندانی ذمہ داریوں سے آزاد ہو رہے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی ''قدیم'' جنسی اخلاقیات بھی رفتہ رفتہ ختم ہو رہی ہے۔ جدید مغرب میں جنسی وفاداری اور جنسی ضبط قصہ ماضی بن رہا ہے کیونکہ ان کی بنیاد زیادہ تر اخلاقیات پر تھی اور اخلاقی تصورات کا معاشرے کی مادی فلاح پر کوئی قابل محسوس فوری اثر نہیں پڑتا۔

یہی وجہ ہے کہ جنسی ضبط تیزی سے اپنی اہمیت کھو رہا ہے۔ اس کی جگہ ''نئی'' اخلاقیات لے رہی ہے جس کے مطابق ہر فرد کو اپنے جسم پر مکمل اختیار اور آزادی حاصل ہے۔ مستقبل قریب میں جنسی پابندیوں کی بنیاد آبادی پر کنٹرول اور اچھی نسل پیدا کرنے پر ہوگی۔ (یہ خدشات اب عملی اور خوفناک شکل میں ہمارے سامنے آ رہے ہیں۔)

یہ مشاہدہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ جس مذہب دشمنی کے ارتقاء کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ کس طرح سوویت یونین میں اپنے منطقی کمال تک پہنچا جو ثقافتی اعتبار سے بقیہ مغربی دنیا سے مختلف نہیں ہے۔ کمیونسٹ تجربہ جدید مغربی تہذیب کی مذہب دشمنی بلکہ روحانی رجحانات کی دشمنی کی بھی تکمیل ہے۔ سامراجی مغرب اور کمیونزم کے مابین مخالفت صرف اس بنا پر نظر آتی ہے کہ مشترکہ نصب العین کی طرف ان کی پیش قدمی کی رفتار مختلف ہے۔ مستقبل میں ان دونوں کی داخلی مماثلت زیادہ سے زیادہ نمایاں ہوتی چلی جائے گی۔ اس کے آثار اب بھی ان دونوں میں نظر آ رہے ہیں۔ ○ ان کا مشترکہ رجحان یہی ہے کہ انسان ایک اجتماعی مشینری، جس کو معاشرہ کہا جاتا ہے، کی خالص مادی ضروریات کے آگے دستبردار ہو جائے لہٰذا اس معاشرہ میں انسان پہیے کے صرف ایک کیل کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس کا صرف ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اس قسم کی تہذیب مذہبی اقدار پر مبنی ثقافت کے لیے زہر ہلاہل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارا بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا اسلامی اندازِ فکر کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب کے تقاضوں کے مطابق زندگی گزارنا ممکن ہے۔ اس کا جواب نفی میں ہے۔ اسلام میں انسان کا پہلا اور بنیادی مقصد اس کا اخلاقی ارتقاء ہے اور اخلاقیات کو

○ روس میں کمیونسٹ انقلاب نومبر 917ء میں برپا ہوا تھا جبکہ کمیونزم اور مغربی تہذیب کی داخلی مماثلت اور مشترکہ نصب العین کا کھلا اظہار 1991ء میں ہوا جب سوویت روس کی شکست و ریخت سے کمیونزم کا نظریاتی قصر زمین بوس ہو گیا اور پھر جمہوری روس یورپ اور امریکہ کے دوش بدوش ہم نوا ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' میں کود پڑا جو سراسر مذہب اسلام کے خلاف برپا کی گئی ہے۔ (ادارہ)

خالص روحانی نظریہ پر فوقیت حاصل ہے جبکہ جدید مغربی تہذیب میں یہ معاملہ بالکل الٹ ہے۔ اس میں مادی فوائد انسان کی تمام سرگرمیوں پر حاوی ہیں۔ اس تہذیب نے اخلاقیات کو قعر گمنامی میں پھینک دیا ہے۔ اب اس کی صرف نظری حیثیت باقی رہ گئی ہے جس کا معاشرے پر ذرہ برابر بھی اثر نہیں۔ ان حالات میں وہاں اخلاقیات کی بات کرنا منافقت کے سوا کچھ نہیں۔ جدید مغربی مفکرین کے نزدیک معقولیت یہی ہے جس کا داخلی جواز بھی موجود ہے کہ مغربی تہذیب کی سماجی قدروں پر قیاس آرائیاں کرتے ہوئے وہ آسمانی اخلاقیات کا ذکر تک نہ کریں اور جو مفکر اچھے اخلاقی رویوں کا واضح تصور نہیں رکھتے ان کے نزدیک آسمانی اخلاقیات کا تصور غیر عقلی یا غیر ناطق بات ہے جیسے ریاضی دان بعض غیر ناطق اعداد استعمال کرتا ہے جو کسی حسی یا مادی شے کی نمائندگی نہیں کرتے تاہم وہ انسانی ذہن کی ساختی حدود کے باعث تصور کے خلا پُر کرنے کے لیے درکار ہوتے ہیں۔

اخلاقیات سے گریز کا رویہ مذہب سے مطابقت نہیں رکھتا، اس لیے جدید مغربی تہذیب کی اخلاقی بنیاد اسلام سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مسلمان مغرب سے طبعی سائنس اور اطلاقی سائنسوں کا علم حاصل نہ کریں لیکن اس کے معنی یہ ضرور ہیں کہ ثقافتی تعلقات قائم نہ کریں۔ زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مغربی تہذیب کی روح، طرزِ زندگی اور سماجی اداروں کی نقل کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ہم اسلامی نظریہ پر کاری ضرب نہ لگا دیں۔

❀❀❀

صلیبی جنگوں کا سایہ

مسلمانوں کو مغربی تہذیب کی نقالی سے کیوں گریز کرنا چاہیے؟ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ دونوں تہذیبوں میں کوئی روحانی مطابقت نہیں ہے۔ مزید برآں متعدد تاریخی تجربات سے بھی مغرب کی اسلام دشمنی واضح ہوتی ہے۔

یہ دشمنی کسی حد تک قدیم یورپ کی وراثت ہے۔ یونانی اور رومی صرف خود کو مہذب سمجھتے تھے اور دوسرے تمام ملکوں خاص طور پر بحیرۂ روم کے (جنوبی اور) مشرقی علاقوں کے رہنے والوں پر انہوں نے بربری (Barbarian)○ کا ٹھپہ لگا رکھا تھا۔ اس وقت ہی سے اہل مغرب نسلی تفاخر میں مبتلا ہیں اور غیر یورپی نسلوں اور قوموں کو انتہائی حقارت سے دیکھتے ہیں جو مغربی تہذیب کا خاصہ بن چکی ہے۔

"بیرونی" مذاہب کے متعلق مغربی تہذیب کا رویہ مغائرت کا ہے۔ لیکن اسلام کے متعلق اس کا رویہ شدید نفرت کا ہے جس کی جڑیں بڑی گہری ہیں۔ یہ رویہ صرف عقلی بنیادوں پر نہیں ہے بلکہ اس میں جذبات کو بھی بڑا دخل ہے۔ مغرب شاید بودھ اور ہندو فلسفہ کو تسلیم نہ کرے لیکن وہ ان مذاہب کے متعلق متوازن اور قابل فہم رویہ اختیار کرتا ہے لیکن جب اسلام کا سوال آتا ہے تو مغربی ذہن کا توازن بگڑ جاتا ہے' اس میں نفرت کے جذبات

○ یورپ والوں نے شمالی افریقہ کے بربروں (بعد میں بربر مسلمانوں) سے جنگوں کے باعث تعصب سے انہیں وحشی (Barbarian) قرار دیتے ہوئے وحشت اور بہیمیت کے معنی میں Barbarianism (بربریت) کی اصطلاح گھڑی لہذا مسلمانوں کو اس کے بجائے درندگی یا سربریت (سنگی سربوں کی درندگی) جیسی اصطلاحیں استعمال کرنی چاہئیں۔ (ادارہ)

اور تعصبات شامل ہو جاتے ہیں۔ چند مستثنیات کے سوا یورپ کے بیشتر مستشرقین اسلام پر لکھتے وقت نا قابل فہم جانبداری کا مظاہرہ کرنے کا جرم کرتے ہیں۔ اسلام کے متعلق انہوں نے جس قسم کی تحقیقات کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقصد اسلام پر ریسرچ کرنا نہیں ہے بلکہ اس کو ججوں کے کٹہرے میں ملزم بنا کر کھڑا کرنا ہے یہاں تک کہ بعض مستشرقین پبلک پراسیکیوٹر کے فرائض انجام دیتے نظر آتے ہیں جو اسلام کو سزا دلوانے پر تلے ہوئے ہیں۔ دوسرے مستشرقین اگرچہ وکیل صفائی کا فریضہ انجام دیتے ہیں لیکن وہ دل سے اسلام کو ملزم سمجھتے ہیں اور نیم دلی سے اپنے موکل کی سزا کم کرنے کی وکالت کرتے ہیں۔ بیشتر مستشرقین نے نتائج اخذ کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ قرون وسطیٰ میں ملحدوں کے خلاف کیتھولک چرچ کی بدنام زمانہ تفتیشی عدالتوں کی یاد دلاتا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ کھلے ذہن سے تاریخی حقائق کی تحقیقات نہیں کرتے بلکہ تقریباً ہر معاملہ میں وہ پہلے سے طے شدہ نتائج سے تحقیقات کی ابتدا کرتے ہیں۔ ان نتائج کی بنیاد اسلام کے خلاف تعصب پر ہے۔ وہ من مانے نتائج حاصل کرنے کے لیے ایسے شواہد ڈھونڈتے ہیں جو ان کے مددگار بن سکیں۔ جہاں ایسے شواہد نہیں ملتے تو وہ بعض شواہد کو سیاق و سباق سے الگ کر کے اپنا کام نکالتے ہیں اور ان شواہد کو غیر سائنسی طور پر اور بد دیانتی سے توڑ مروڑ کر اپنے مطلب کا نتیجہ نکالتے ہیں۔ وہ اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ اس معاملہ میں دوسرے فریق یعنی مسلمانوں کا موقف کیا ہے۔

اس طریق کار سے اسلام کی عجیب و غریب مسخ شدہ تصویر بنائی گئی ہے۔ مغرب میں مشرق کے متعلق جو لٹریچر شائع ہوتا ہے اس میں اسلام کی یہی تصویر دکھائی جاتی ہے۔ اسلام کو مسخ کرنے کا یہ متعصبانہ فعل صرف ایک ملک تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ انگلستان' جرمنی' امریکہ' روس' اٹلی اور ہالینڈ میں ہر کہیں پایا جاتا ہے۔ غرضیکہ جہاں بھی مغربی مستشرقین نے

اپنی توجہ اسلام کی طرف مبذول کی ہے انہوں نے اسلام کی یہی مسخ شدہ تصویر پیش کی ہے۔ یہ اس سے عقلی لذت پاتے ہیں۔ انہیں جب بھی موقع ملتا ہے وہ اسلام کے خلاف لکھنے میں لذت حاصل کرتے ہیں۔ ان مستشرقین کی کوئی خاص نسل نہیں۔ یہ اپنی تہذیب اور اپنے ماحول کے ترجمان ہیں اس لیے ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنے سے ہچکچانا نہیں چاہیے کہ یورپ اور امریکہ کا ذہن بحیثیت مجموعی ''اسلام بطور مذہب اور ثقافت'' کے خلاف تعصب سے معمور ہے۔ [4]

اس مخالفت کی ایک اور وجہ قدیم نقطۂ نظر ہے جس نے دنیا کو ''یورپی'' اور ''بربری'' میں تقسیم کر دیا تھا۔ دوسری وجہ جو اسلام سے براہ راست تعلق رکھتی ہے ماضی کی طرف نگاہ دوڑانے' خاص طور پر قرون وسطیٰ کی تاریخ کو پیش نظر رکھنے سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔

متحدہ یورپ اور اسلام کے درمیان پہلا بڑا تصادم یعنی صلیبی جنگیں عین اس وقت برپا ہوئیں جب یورپی تہذیب کا آغاز ہو رہا تھا۔ اس وقت اس تہذیب کا ابھی کلیسا سے کچھ جوڑ باقی تھا۔ روم کے زوال کے بعد کئی تاریک صدیوں تک یہ تہذیب تاریکی سے نکلنے کے لیے کوشاں رہی۔ اس وقت اس کے لٹریچر پر بہار آ رہی تھی۔ گوتھوں' ہنوں اور آواروں ○ کی جنگجویانہ دراندازی سے فنون لطیفہ پر جو غفلت طاری ہو گئی تھی' اب وہ اس

④ اس اعتبار سے پچھلی نصف صدی کے نصف آخر میں یورپ اور امریکہ کے مستشرقین کے لب و لہجہ میں نمایاں بہتری نظر آتی ہے۔ اگرچہ ایک معمولی اقلیت نے ابھی تک اپنے تعصبات ختم نہیں کیے لیکن بحیثیت مجموعی اسلام اور مسلم دنیا کے متعلق مغرب کی تحریروں میں بتدریج بہتری آ رہی ہے اور وہ اسلامی فکر اور مسلم مقاصد کی تحسین کر رہے ہیں اور اب مستشرقین جو سنجیدہ چیزیں لکھ رہے ہیں ان میں سے اسلام کی شکل کو مسخ کرنے کا پرانا شعوری یا لاشعوری رجحان ختم ہو رہا ہے۔

○ آوار جنوب مشرقی یورپ کی ایک جنگجو قوم تھے جنہوں نے چھٹی سے نویں صدی عیسوی تک بحیرۂ اسود سے لے کر بحیرۂ اڈریاٹک تک اپنی سلطنت قائم کر لی تھی۔ (ادارہ)

سے بیدار ہو رہے تھے۔ یورپ ابھی ابتدائی قرون وسطیٰ کے کٹھن حالات سے نکلا ہی تھا اور اس نے ایک نیا ثقافتی شعور حاصل کیا تھا۔ اس انتہائی نازک دور میں صلیبیوں کا عالم اسلام سے معاندانہ تصادم ہوا۔

صلیبی جنگوں سے پہلے بھی مسلمانوں اور یورپیوں کا تصادم ہو چکا تھا جب عربوں نے سسلی' اسپین اور جنوبی فرانس پر حملے کیے تھے لیکن یہ حملے یورپی نقطۂ نگاہ سے یورپ میں نئے ثقافتی شعور کی بیداری سے قبل ہوئے تھے۔ ان جنگوں کی نوعیت مقامی معاملات کی تھی اور ان کی اہمیت کو پوری طرح نہیں سمجھا جا سکا تھا۔ اب صلیبی جنگوں نے اسلام کے متعلق یورپی رویے کا فیصلہ کر دیا جو صدیوں تک قائم رہا۔ یہ صلیبی جنگیں فیصلہ کن تھیں کیونکہ وہ یورپ کے بچپنے میں ہوئیں۔ یہ وہ دور تھا جب یورپ میں پہلی بار ثقافتی خصوصیات ابھرنا شروع ہوئی تھیں اور ابھی ارتقائی مرحلہ میں تھیں۔ جیسا کہ افراد کے معاملہ میں ہوتا ہے اسی طرح قوموں کے ساتھ بھی ہوتا ہے کہ بچپنے میں شعور اور لاشعور پر جو اثرات مرتسم ہو جاتے ہیں وہ آخر عمر تک برقرار رہتے ہیں۔ یہ اثرات اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ ان کو کھرچ کر نکال دینا بھی ممکن نہیں ہوتا' البتہ عقلی تجربات اور غور و فکر سے ان کو کم کیا جا سکتا ہے۔ یہی کچھ صلیبی جنگوں کے معاملہ میں بھی ہوا۔ انہوں نے یورپ کی عوامی نفسیات پر انتہائی گہرے اور پائیدار اثرات چھوڑے۔ ان جنگوں کے ذریعہ اس زمانہ میں عوامی جوش و خروش کا جو سیلاب آیا ویسا سیلاب نہ پہلے کبھی آیا تھا اور نہ بعد میں آیا۔ پورے براعظم یورپ میں جذباتی کیفیت طاری ہو گئی جس نے ریاستوں' قوموں اور عوام کے درمیان حائل تمام سرحدوں کو پھلانگ لیا۔ اس وقت تاریخ میں پہلی بار یورپ نے اتحاد کا مظاہرہ کیا جو عالم اسلام کے خلاف تھا۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ جدید یورپ نے صلیبی جنگوں کی روح سے جنم لیا ہے۔ قبل ازیں لوگ اینگلو سیکسن' جرمن' فرانسیسی' نارمن' اطالوی اور ڈینش تھے لیکن

صلیبی جنگوں کے دوران ''عالم عیسائیت'' (Christendom) کا نیا تصور پیدا ہوا جو تمام یورپی قوموں کا مشترکہ مقصد قرار پایا (کسی بھی صورت میں یہ ''عیسائیت'' کے مذہبی تصور سے مطابقت نہیں رکھتا تھا) یہ مشترکہ مقصد اسلام کے خلاف نفرت کا مقصد ہے جو ''عالم عیسائیت'' کے لیے پہاڑی کے چراغ کی حیثیت اختیار کر گیا۔

تاریخ کی سب سے بڑی ستم ظریفی یہ ہے کہ مغربی دنیا کے پہلے اجتماعی شعور یا ذہنی بیداری کے پیچھے کلیسا کا ہاتھ تھا لیکن بعد ازاں مغرب کو جو کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں وہ کلیسا کی ہر بات سے ذہنی بغاوت کی مرہون منت ہیں۔

یہ عیسائی کلیسا اور اسلام دونوں کے نقطہ نظر سے بڑا المیہ ہوا۔ کلیسا کے لیے اس اعتبار سے المیہ کہ اس نے یورپ کے ذہنوں پر جو قبضہ کر رکھا تھا اس سے محروم ہو گیا اور اسلام کے لیے یہ المیہ اس لیے ہوا کہ اس کو کئی صدیوں تک مختلف شکلوں اور بھیسوں میں صلیبی جنگوں کا سامنا کرنا پڑا۔

پارسائی کا دعویٰ کرنے والے صلیبیوں نے اپنے مفتوحہ علاقوں میں تباہی و بربادی مچائی اور مسلمانوں پر ایسے ایسے مظالم ڈھائے جو چشم فلک نے کبھی نہ دیکھے ہوں گے۔ ان علاقوں کو مسلمانوں نے بالآخر دوبارہ فتح بھی کر لیا لیکن ان صلیبیوں کے ہاتھوں جو ناقابل بیان ظلم ہوئے ان میں سے ایک ظلم یہ بھی تھا کہ اس نے صدیوں کے لیے دشمنی کا زہریلا بیج بو دیا جس نے ابھی تک مشرق اور مغرب کے تعلقات میں زہر گھول رکھا ہے حالانکہ اس دشمنی کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اگرچہ اسلام اور مغرب کی روحانی بنیادوں اور سماجی مقاصد میں اختلافات ہیں لیکن اس کے باوجود یہ ایک دوسرے کو برداشت کر سکتے ہیں اور دوستانہ تعلقات قائم رکھ سکتے ہیں۔ یہ امکانات صرف نظری نہیں بلکہ حقیقی ہیں کیونکہ مسلمانوں کی طرف سے ہمیشہ ہی باہمی رواداری اور عزت و احترام کے تعلقات کے قیام کی مخلصانہ

کوشش رہی ہے۔ جب خلیفہ ہارون الرشید نے اپنا سفیر (فرانس کے) شہنشاہ شارلیمان کے پاس بھیجا تو اس کے پیچھے یہی خواہش کام کر رہی تھی کیونکہ اس کا مقصد دوستی کر کے مادی فوائد حاصل کرنا نہیں تھا۔ اس موقع پر یورپ ذہنی طور پر اتنا جامد تھا کہ وہ اس کے مضمرات کو پوری طرح سمجھ نہیں سکا لیکن مسلمانوں کے اس اقدام پر یقیناً ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا گیا۔ بعد ازاں صلیبی اچانک ہی منظر پر نمودار ہو گئے اور انہوں نے اسلام اور مغرب کے تعلقات کو مسموم کر دیا۔ اس وجہ سے نہیں کہ وہ جنگ چاہتے تھے کیونکہ قوموں کے درمیان کئی جنگیں لڑی گئیں اور بعد میں فراموش کر دی گئیں، بہت سی دوستیاں دشمنیوں میں تبدیل ہو گئیں لیکن صلیبیوں نے جو خباثت کی وہ صرف ہتھیاروں کے ٹکراؤ تک محدود نہ تھی بلکہ یہ پہلی ذہنی خباثت تھی جس نے مسلم دنیا کے خلاف یورپی ذہن کو مسموم کر دیا۔ کلیسا کی رہنمائی میں دیدہ دانستہ اسلامی تعلیمات اور نظریات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا۔ ان صلیبی جنگوں کے موقع پر یورپی ذہن میں اسلام کے متعلق یہ مضحکہ خیز تصور پیدا کیا گیا کہ اسلام (نعوذ باللہ) حیوانی خواہشات، سفاکی اور ظاہری رسوم و رواج کا مذہب ہے، اس کا قلب و نظر کی پاکیزگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام کی یہی مسخ شدہ تصویر ایک طویل عرصہ تک یورپی ذہن پر مسلط رہی۔

نفرت کے بیج بو دیے گئے تھے۔ جلد ہی صلیبی جنگوں کے اثرات یورپ کے دوسرے مقامات پر بھی پڑنے لگے۔ انہوں نے اسپین کے عیسائیوں کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ اپنے ملک کو ''کافروں کے شکنجے'' سے آزاد کرائیں۔ مسلم اسپین کی تباہی و بربادی اور نسل کشی میں صدیاں لگیں۔ لیکن اس طویل جدوجہد کی وجہ سے یورپ میں اسلام کے خلاف جذبات مزید گہرے اور پائیدار ہو گئے۔ اس کے نتیجہ میں اسپین میں مسلمانوں کو منظم طریقہ اور نہایت بے رحمی سے قتل کیا گیا۔ اس قتل عام کا پورے یورپ میں جشن منایا گیا۔ اگرچہ اس کے مابعد اثرات ایک شاندار ثقافت کی تباہی کی صورت میں نمودار ہوئے اور اس کی جگہ قرون وسطیٰ کی

جہالت اور گنوارپن نے لے لی۔ لیکن مسلم سپین کی آخری باقیات کی تباہی سے پہلے 1492ء میں مسیحی اسپین نے غرناطہ کی سلطنت کو دوبارہ فتح کر لیا۔ یہ تیسرا اہم واقعہ تھا جس نے مغربی دنیا اور اسلام کے تعلقات مزید خراب کر دیے۔ یورپ کی نگاہوں میں بازنطینی سلطنت میں اب بھی یونان اور روم کی کچھ نہ کچھ شان و شوکت باقی تھی جس کو ایشیا کے ''وحشیوں'' (Barbarians) کے مقابلہ میں یورپ کا مضبوط قلعہ سمجھا جاتا تھا' اس کے سقوط (1453ء) کے بعد مسلمانوں کے لیے یورپ کا دروازہ کھل گیا۔ اس کے بعد کی صدیوں میں یورپ کی اسلام دشمنی صرف ثقافتی نوعیت کی نہیں رہی بلکہ اس کی سیاسی اہمیت بھی ہو گئی جس سے دشمنی میں مزید اضافہ ہو گیا۔

ان حالات میں یورپ کو جنگوں سے بڑا فائدہ ہوا۔ نشاۃ ثانیہ یعنی یورپ میں فنون اور علوم کا احیاء ہوا۔ یہ علوم یورپ نے اسلام' خاص طور پر عربوں سے بڑے پیمانہ پر مستعار لیے۔ اس کی بڑی وجہ مشرق اور مغرب میں رابطے تھے۔ ثقافت کے میدان میں اسلام کے مقابلہ میں یورپ کو بہت زیادہ فائدہ ہوا لیکن یورپ نے دیرینہ دشمنی کی وجہ سے مسلمانوں کے اس ابدی احسان کو مان کر نہیں دیا۔ اس کے برعکس وقت گزرنے کے ساتھ دشمنی بڑھتی گئی اور مغرب کے مزاج کا حصہ بن گئی۔ ''مسلمان'' کا لفظ سنتے ہی ان کے دل میں دشمنی کے جذبات بھڑک اٹھتے۔ سب سے زیادہ غیر معمولی بات یہ ہوئی کہ ثقافتی تبدیلیوں کے باوجود یہ دشمنی برقرار رہی۔ جب اصلاح کا دور آیا تو مذہب نے پورے یورپ کو تقسیم کر دیا اور مختلف فرقے ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار ہو گئے اور اسلام دشمنی ان سب میں قدر مشترک ہو گئی۔ ایک زمانہ آیا جب یورپ میں مذہبی جذبات ماند پڑنے لگے لیکن اس زمانہ میں بھی اسلام دشمنی برقرار رہی۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ عظیم فرانسیسی مفکر والٹیر اٹھارہویں صدی میں عیسائی کلیسا کے سخت دشمنوں میں سے تھا اور ساتھ ساتھ وہ اسلام اور

اس کے پیغمبر ﷺ سے جنون کی حد تک نفرت کرتا تھا۔ کچھ عشروں کے بعد ایک وقت آیا جب مغرب کے عالم فاضل لوگوں نے بیرونی ثقافتوں کا ہمدردانہ مطالعہ شروع کر دیا لیکن اسلام دشمنی نے ان کی علمی تحقیقات کو غیر جانبدار رہنے نہیں دیا۔ بدقسمتی سے تاریخ نے یورپ اور عالم اسلام کے درمیان جو خلیج حائل کر دی تھی وہ پاٹی نہیں جا سکی۔ اسلام سے نفرت یورپی فکر کا جزو لاینفک بن گئی۔ یہ حقیقت ہے کہ موجودہ دور کے پہلے مستشرقین مسلمان ملکوں میں کام کرنے والے عیسائی مشنری تھے۔ انہوں نے اسلام کی تعلیمات اور تاریخ کو مسخ کر کے بیان کیا جس کا مقصد ''کافروں'' کے متعلق یورپی باشندوں میں تعصب پیدا کرنا تھا۔ لیکن اب جبکہ مشرقی علوم کو مشنری اثرات سے نجات مل گئی ہے اور یورپی ذہن گمراہ کن مذہبی جوش نہیں رکھتا' اسلام کے متعلق ہنوز متعصبانہ ذہن موجود ہے۔ یہ تعصب آباؤ اجداد کی جہالت کی وجہ سے ہے اور صلیبی جنگوں کا نتیجہ ہے جنہوں نے ابتدائی یورپ کے ذہنوں پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔[5]

یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہوا کہ اتنی پرانی مخاصمت جو بنیادی طور پر مذہبی تھی اور عیسائی کلیسا کے غلبہ کی وجہ سے تھی' اب بھی مغرب میں موجود ہے جبکہ وہاں مذہبی

---

⑤ یہ واضح رہنا چاہیے کہ یہ تحریر 1933 میں لکھی گئی تھی۔ جیسا کہ میں نے فٹ نوٹ (4) میں ذکر کیا ہے پچھلے چند عشروں سے مستشرقین کے لٹریچر میں تبدیلی آئی ہے۔ لیکن جہاں تک یورپ اور امریکہ کے عمومی ذہن کا تعلق ہے اس میں اسلام اور اس سے متعلقہ امور کے بارے میں متوازن رویہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ بڑی حد تک اس کی ذمہ داری مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔ ایک طرف وہ مغرب میں اسلامی فکر کو مسلسل اور کسی قاعدے قرینے سے پیش نہیں کر سکے ہیں کیونکہ انہوں نے مغربی ذہنیت اور مغربی انداز کو پیش نظر نہیں رکھا۔ دوسری طرف مسلمانوں نے اپنے مذہب اور سماجی و سیاسی مقاصد کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ بہت تند و تیز ہے اس لیے اس کو معقول تصور نہیں کیا گیا' حالانکہ اسلام اور مغرب میں مکالمہ کے لیے معقول اور مدلل بات کہنے کی ضرورت ہے۔

جذبات تقریباً ختم ہو چکے ہیں۔

جدید ماہرین نفسیات کے نزدیک اس قسم کا متضاد طرز عمل حیران کن نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے ذہن میں بچپن میں ڈالے گئے مذہبی عقائد سے دستبردار ہو بھی جائے تب بھی کوئی خاص نوعیت کا توہم جس کا تعلق مسترد شدہ عقیدہ سے ہو اس کے ذہن میں موجود رہتا ہے جس کے خلاف وہ ساری زندگی کسی قسم کی دلیل سننے کو تیار نہیں ہوتا۔ اسلام کے متعلق مغربی طرز عمل ایسا ہی ہے۔ اگرچہ اسلام دشمنی کی بنیاد پر قائم ہونے والے تعصبات اب زندگی کے مادہ پرستانہ تصور کے آگے سرنگوں ہو چکے ہیں لیکن مغربی انسان کے لاشعور میں پرانی دشمنی اب بھی موجود ہے۔ اس کی شدت ہر انسان میں مختلف ہو سکتی ہے لیکن اس کی موجودگی سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ مغرب میں صلیبی جنگوں کا جذبہ اب بھی سایہ فگن ہے جو مسلمانوں اور تمام اسلامی امور کے متعلق اس کے رویہ کو متاثر کرتا ہے۔

مسلمانوں کے حلقوں میں اکثر یہ بات سننے میں آتی ہے کہ ماضی کی جنگوں کی وجہ سے یورپ اور امریکہ میں اسلام سے جو نفرت پیدا ہوئی تھی' اب وہ بتدریج ختم ہو رہی ہے۔ ۞ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسلام کی مذہبی و سماجی تعلیمات کی وجہ سے مغرب میں اسلام کی طرف مائل ہونے کے آثار ہیں۔ بہت سے مسلمان سنجیدگی سے یہ سمجھتے ہیں کہ یورپ اور امریکہ کا سواد اعظم جلد ہی اسلام قبول کر لے گا۔ یہ خیال بذات خود نامعقول نہیں ہے کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ تمام مذاہب میں سے صرف اسلام ہی انسان کی فطرت کے مسلمات

۞ 11 ستمبر 2001ء کے بعد امریکہ' برطانیہ اور دیگر یورپی ممالک کی نام نہاد دہشت گردی کے خلاف "جنگ" کے باعث مغرب میں اسلام کے خلاف نفرت کی نئی لہر اٹھی ہے تاہم مغرب میں اسلام کا مطالعہ اور اسے قبول کرنے والوں کی تعداد بھی تیزی سے بڑھی ہے۔ (ادارہ)

پر مبنی ہے اور انسانی معاشرہ کی تمام ضروریات کو پوری کرتا ہے۔ ہمارے پیغمبر ﷺ نے ہمیں بتایا ہے کہ بالآخر تمام انسانیت اسلام قبول کر لے گی لیکن بدقسمتی سے اس کا ذرہ بھر امکان نظر نہیں آ رہا ہے کہ مستقبل قریب میں ایسا ہو جائے۔ جہاں تک مغربی تہذیب کا تعلق ہے وہ اسلام کی طرف اسی صورت میں راغب ہو سکتی ہے جب وہ یکے بعد دیگرے کئی خوفناک سماجی انقلابوں سے دوچار ہو جائے جس سے مغرب کی موجودہ ثقافتی خود فریبی کا پردہ چاک ہو اور اس کی ذہنیت یکسر تبدیل ہو جائے اور وہ زندگی کی مذہبی توجیہ کو قبول کر لے۔ آج مغربی دنیا مادی کامیابیوں کے نشہ میں بدمست ہے اور یہ سمجھتی ہے کہ عیش و طرب کی زندگی ہی وہ نصب العین ہے جس کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ مغرب کی مادہ پرستی کی ہوس برابر بڑھتی جا رہی ہے اور اس میں کمی نہیں ہو رہی' جیسا کہ بعض مسلمان سمجھتے ہیں' اور نہ مذہب کی مخالفت میں کمی آ رہی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جدید سائنس نے یہ تسلیم کرنا شروع کر دیا ہے کہ کارخانہ قدرت کے پیچھے ایک ہی تخلیقی قوت کارفرما ہے' اس سے خوش فہم لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ مغربی دنیا میں مذہب کے متعلق نیا شعور اجاگر ہو رہا ہے لیکن یہ خیال مغربی سائنسی فکر کے متعلق غلط فہمی پر مبنی ہے۔ کوئی سنجیدہ سائنسدان بھی اس امکان کا انکار نہیں کر سکتا کہ یہ کائنات کسی واحد حرکی سبب سے وجود میں آئی ہے۔ ہمیشہ سے یہ سوال رہا ہے اور اب بھی ہے کہ اس واحد "سبب" کی صفات کیا ہیں۔ تمام آسمانی مذاہب کا دعویٰ ہے کہ یہ طاقت سمیع و بصیر ذات ہے' اسی ذات نے دنیا تخلیق کی ہے اور وہ ایک خاص منصوبہ اور مقصد کے تحت کائنات کو چلا رہی ہے۔ وہ مختار کل ہے' دوسرے الفاظ میں وہ اللہ تعالیٰ ہے لیکن جدید سائنس اس حد تک جانے کے لیے تیار نہیں (درحقیقت یہ اس کے دائرہ میں نہیں آتا) اور وہ سمیع و بصیر خالق کے سوال کو کھلا چھوڑ دیتی ہے۔ اس کا رویہ کچھ اس قسم کا ہے "ہو سکتا ہے کہ ایسا ہو لیکن مجھے معلوم نہیں کیونکہ

میرے پاس اس کے جانے کا کوئی سائنسی طریقہ نہیں ہے۔" مستقبل میں یہ نظریہ شاید وحدت الوجود کی قسم کے نظریہ میں ڈھل جائے جس میں روح اور مادہ' مقصد اور وجود' خالق و مخلوق سب ایک ہی ہوں۔ اس تصور کو اللہ تعالیٰ کے اسلامی تصور کی طرف مثبت قدم قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ یہ مادہ پرستی سے جدائی نہیں ہے بلکہ زیادہ واضح عقلی سطح پر اسی کی معراج ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آج مغرب اسلام سے جتنا دور ہے' اتنا پہلے کبھی نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارے مذہب کی سرگرم مخالفت اب زوال پذیر ہو لیکن اس کی وجہ مغرب کی طرف سے اسلامی تعلیمات کی خوبیوں کو تسلیم کرنا نہیں ہے بلکہ عالم اسلام کی ثقافتی کمزوریاں اور اس کی ٹوٹ پھوٹ ہے۔ کسی زمانہ میں یورپ اسلام سے خوفزدہ تھا جس کی بنا پر وہ ہر اس چیز کا دشمن تھا جو اسلامی رنگ میں رنگی ہوئی ہوتی' کہ وہ خالص روحانی اور سماجی امور میں بھی اسکا مخالف تھا لیکن ایسے وقت میں جب مسلمان زوال پذیر ہیں اور یورپ کے سیاسی مفادات کو اسلام سے کوئی خطرہ نہیں رہا' اسلام کے متعلق مغرب کے خوف میں کمی آ گئی ہے۔ اسلام کی مخالفت کی شدت میں کمی کی بھی یہی وجہ ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ مغرب اسلام کے قریب آ گیا ہے' اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مغرب اسلام سے بے تعلق ہو گیا ہے۔ [6]

[6] مسلم دنیا میں تیل کی وجہ سے دولت میں بہت زیادہ اضافہ نے عالمی اقتصادیات اور سیاست میں اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے لہٰذا عالم اسلام میں مغرب کو خاص دلچسپی پیدا ہو گئی ہے خاص طور پر تجارت اور تاریخ کے میدان میں لیکن مذہب کے اعتبار سے اب بھی مغرب میں اسلام کو نہیں چاہا جاتا۔ حالانکہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں اکثر مکالمے اور مذاکرے ہوتے رہتے ہیں۔

نوٹ: اسامہ بن لادن اور القاعدہ کے خلاف جنگ اور افغانستان اور عراق پر امریکہ' یورپ اور آسٹریلیا کی صلیبی یلغار مشرق اوسط کے تیل پر قبضے اور اسرائیل کے مفادات کے تحفظ کی خاطر عمل میں آئی ہے۔ (ادارہ)
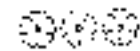
اسلام کے متعلق مغربی رویہ

کسی بھی طور پر مغربی تہذیب نے اسلام کے متعلق اپنا ذہنی رویہ تبدیل نہیں کیا۔ وہ آج بھی پہلے کی طرح زندگی کے مذہبی تصور کی مخالف ہے اور اس بات کی کوئی معقول شہادت موجود نہیں کہ مستقبل قریب میں اس رویہ میں تبدیلی آ جائے گی۔ مغرب میں اسلامی مشنوں کا قیام اور بعض یورپیوں اور امریکیوں کا قبول اسلام (بیشتر صورتوں میں اسلامی تعلیمات کو پورے طور پر سمجھے بغیر) تبدیلی کی دلیل نہیں ہے۔ ایک ایسے دور میں جس میں مادہ پرستی کا ہر طرف رواج ہے' چند افراد کا روحانی اقدار کی تلاش میں مذہبی تصورات پر مبنی کسی عقیدہ کے متعلق ذوق و شوق سے تقاریر سننا بالکل فطری بات ہے۔ مغرب میں صرف مسلمانوں ہی کے مشن نہیں ہیں' وہاں عیسائیوں کے بے شمار راہبانہ فرقے بھی موجود ہیں جن میں اصلاحات کے رجحانات ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد خاصی طاقتور تحریکیں ہیں جو گیان دھیان پر زور دیتی ہے۔ بودھوں کے مندر اور مشن ہیں اور یورپ اور امریکہ کے شہروں میں بودھ مذہب قبول کرنے والے بھی ہیں۔ مسلمانوں کے مشن جو دلائل دیتے ہیں وہی دلائل بودھ مشن بھی دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یورپ بودھ مت کے قریب آ رہا ہے۔ مسلمانوں کی طرح بودھوں کا دعویٰ بھی مضحکہ خیز ہے۔ چند لوگوں کے بودھ مذہب یا اسلام قبول کر لینے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان مذاہب نے مغربی زندگی پر واقعی اثر انداز ہونا شروع کر دیا ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی مذہب معمول سے زیادہ تجسس پیدا نہیں کر سکا اور جو تجسس پیدا ہوا ہے وہ محض اس لیے پیدا ہوا ہے کہ روحانیت کے متلاشی لوگوں کے ذہنوں کو بدیسی عقائد کا سحر متاثر کرتا ہے۔ یقینی طور پر بعض قابل ذکر

www.ebooksland.blogspot.com

استثناء بھی ہیں اور اسلام قبول کرنے والے نئے لوگوں میں بعض حقیقت کے متلاشی ہوتے ہیں۔ لیکن ان استثنائی واقعات کی بنیاد پر تہذیب کی تبدیلی کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ دوسری طرف اگر ہم ان مستثنیات کی تعداد کا ان مغربی لوگوں کی تعداد سے موازنہ کریں جو مادہ پرستی ایسے خالص مادہ پرستانہ نظریہ کی طرف جوق در جوق راغب ہو رہے ہیں تو ہم صحیح طور پر مغربی تہذیب کے حقیقی رجحان کا اندازہ کر سکیں گے۔

جیسا کہ پہلے بھی اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے کہ بڑھتی ہوئی سماجی اور اقتصادی بے چینی کی وجہ سے عالمی جنگوں کا سلسلہ شروع ہو سکتا ہے جس کی نہ معلوم کتنی جہتیں ہوں گی اور جن میں تباہ کن سائنسی ہتھیار استعمال ہوں گے۔ اس کے نتیجہ میں مغربی تہذیب کی مادہ پرستانہ خود فریبی کے اتنے ہولناک نتائج نکلیں گے کہ انسان ایک مرتبہ پھر انتہائی جوش و خروش اور عاجزی سے حقیقی روحانی حقائق کی تلاش میں نکل کھڑا ہوگا۔ اس کے بعد مغرب میں اسلام کی کامیاب تبلیغ ممکن ہوگی۔ لیکن یہ تبدیلی ابھی مستقبل کے پردہ میں چھپی ہوئی ہے۔ مسلمانوں کا یہ کہنا خطرناک قسم کی غلط فہمی ہے کہ اسلامی اثرات مغرب کی روح کو فتح کرنے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس قسم کی باتیں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مہدی کی آمد کے عقیدہ کو عقلیت پسندی کا جامہ پہنا دیا جائے۔ یہ عقیدہ کہ اچانک ایک طاقت کا ظہور ہوگا جو زوال پذیر مسلمان معاشرہ کو دنیا پر غالب کر دے گی، خطرناک ہے کیونکہ یہ ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنے سے گریز کی راہ دکھاتا ہے کہ ہم اب ثقافتی طور پر کچھ بھی نہیں رہے۔ مسلم دنیا پر آج مغربی اثرات بہت گہرے ہیں۔ ہم خواب غفلت میں پڑے ہوئے ہیں جبکہ یہ اثرات ہر جگہ اسلامی معاشرہ کو تباہ و برباد کر رہے ہیں۔ اسلام کے غلبہ کی خواہش ایک چیز ہے لیکن اس خواہش پر جھوٹی توقعات وابستہ کرنا دوسری چیز ہے۔ ⓘ

ⓘ اس کتاب کے فاضل مصنف اگرچہ ایمانی جذبوں سے سرشار رہے اور حدیث کو سنت کا اہم ماخذ تسلیم

کرتے تھے اور مجموعہ احادیث کی صحت کے قائل تھے مگر ظہور مہدی کے ضمن میں وہ یہاں ایک علمی لغزش کا شکار ہوئے ہیں۔ متواتر احادیث میں ظہور مہدی کے سلسلے میں جو آثار و علامات درج ہیں وہ اس قدر واضح اور دوٹوک ہیں کہ ان کے بارے میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔

ⓘ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«الْمَهْدِيُّ مِنِّي، أَجْلَى الْجَبْهَةِ، أَقْنَى الْأَنْفِ، يَمْلَأُ الْأَرْضَ قِسْطًا وَعَدْلًا كَمَا مُلِئَتْ ظُلْمًا وَجَوْرًا، وَيَمْلِكُ سَبْعَ سِنِينَ» (سنن أبي داود، المهدي، حديث: ٤٢٨٥)

"مہدی مجھ سے (یعنی میری نسل سے) ہوگا، اس کی پیشانی فراخ اور ناک بلند ہوگی، وہ زمین کو عدل سے بھر دے گا جو ظلم و زیادتی سے بھری ہوگی اور سات سال حکومت کرے گا۔"

ⓘ سیدہ ام سلمہ ام المومنین رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«يَكُونُ اخْتِلَافٌ عِنْدَ مَوْتِ خَلِيفَةٍ فَيَخْرُجُ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ هَارِبًا إِلَى مَكَّةَ، فَيَأْتِيهِ نَاسٌ مِنْ أَهْلِ مَكَّةَ، فَيُخْرِجُونَهُ وَهُوَ كَارِهٌ، فَيُبَايِعُونَهُ بَيْنَ الرُّكْنِ وَالْمَقَامِ، وَيُبْعَثُ إِلَيْهِ مِنَ الشَّامِ، فَيُخْسَفُ بِهِمْ بِالْبَيْدَاءِ بَيْنَ مَكَّةَ وَالْمَدِينَةِ، فَإِذَا رَأَى النَّاسُ ذَلِكَ أَتَاهُ أَبْدَالُ الشَّامِ وَعَصَائِبُ أَهْلِ الْعِرَاقِ فَيُبَايِعُونَهُ، ثُمَّ يَنْشَأُ رَجُلٌ مِنْ قُرَيْشٍ أَخْوَالُهُ كَلْبٌ، فَيَبْعَثُ إِلَيْهِمْ بَعْثًا، فَيَظْهَرُونَ عَلَيْهِمْ، وَذَلِكَ بَعْثُ كَلْبٍ، وَالْخَيْبَةُ لِمَنْ لَمْ يَشْهَدْ غَنِيمَةَ كَلْبٍ، فَيَقْسِمُ الْمَالَ وَيَعْمَلُ فِي النَّاسِ بِسُنَّةِ نَبِيِّهِمْ ﷺ، وَيُلْقِي الْإِسْلَامُ بِجِرَانِهِ إِلَى الْأَرْضِ، فَيَلْبَثُ سَبْعَ سِنِينَ، ثُمَّ يُتَوَفَّى وَيُصَلِّي عَلَيْهِ الْمُسْلِمُونَ - قَالَ أَبُو دَاوُدَ: وَقَالَ بَعْضُهُمْ عَنْ هِشَامٍ: "تِسْعَ سِنِينَ" وَقَالَ بَعْضُهُمْ: "سَبْعَ سِنِينَ"» (سنن أبي داود، المهدي، حديث: ٤٢٨٦)

"ایک خلیفہ کی موت پر اختلاف ہوگا، پھر اہل مدینہ سے ایک آدمی بھاگتا ہوا مکہ پہنچے گا۔ اہل مکہ اس کے پاس آئیں گے اور اسے امامت کے لیے کھڑا کریں گے، حالانکہ وہ اس عمل کو ناپسند کرتا ہوگا اور وہ اس کے ہاتھ پر حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان بیعت کریں گے۔ پھر شام والوں کی طرف سے اس کے خلاف ایک لشکر بھیجا جائے گا جو مکہ اور مدینہ کے درمیان بیداء کے مقام پر زمین میں دھنسا دیا جائے گا۔ لوگ جب یہ حال دیکھیں گے تو شام کے ابدال (صالحین) اور اہل عراق کی جماعتیں اس کے پاس آئیں گی اور اس کے ہاتھ پر بیعت کریں گی۔ پھر قریش میں سے ایک آدمی اٹھے گا جس کا ننھیال بنو کلب میں ہوگا، پھر وہ (قریشی کلبی) ان (مہدی کی بیعت کرنے والوں) کے

مقابلے میں ایک لشکر بھیجے گا تو وہ مہدی والے ان پر غالب آ جائیں گے۔ سو بنوکلب کا یہی لشکر ہوگا (جو مغلوب ہوگا) اور خسارہ ہوگا اس کے لیے جو بنوکلب کی غنیمت میں حاضر نہ ہوگا۔ مہدی مال تقسیم کرے گا اور لوگوں میں ان کے نبی (ﷺ) کی سنت نافذ کرے گا اور اسلام کو ثبات اور استحکام حاصل ہوگا اور پھر وہ سات سال تک (حکمران) رہے گا۔ اس کے بعد اس کی وفات ہو جائے گی اور مسلمان اس کا جنازہ پڑھیں گے۔'' امام ابوداود رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعض راویوں نے ہشام سے ''نو سال'' روایت کیے ہیں اور بعض نے سات سال۔''

۞ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں:

«اِسْمُهُ اِسْمِي وَاسْمُ أَبِيهِ اِسْمُ أَبِي»(سنن أبي داود، المهدي، حديث: ٤٢٨٢)

''اس (مہدی) کا نام میرے نام اور اس کے باپ کا نام میرے باپ کے نام جیسا ہوگا۔''

چونکہ امام مہدی کے بارے میں لوگ بالعموم افراط و تفریط کا شکار رہے ہیں، اس کی وجہ سے بعض لوگوں نے تو ان کی شخصیت اور آمد ہی کا انکار کر دیا اور کئی طبع آزما قسم کے لوگوں نے اپنے مہدی ہونے کا باطل دعویٰ کر ڈالا، حالانکہ امام مہدی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ ورود سے پہلے آئیں گے اور ان کے نزولِ آسمانی کے وقت ظہور پذیر ہو چکے ہوں گے۔ ظہورِ مہدی کے بارے میں روایات معنوی طور پر حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں، اس لیے ان کا انکار گمراہی ہے اور ان پر ایمان رکھنا ایک شرعی اور ایمانی ضرورت ہے۔ مہدی آئیں گے اور وہ حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی اولاد سے ہوں گے اور مسلمان امت کو اس ظلم اور جبر سے نجات دلائیں گے جو مدت سے ان پر مسلط ہے۔ مسلمان امت کی یہ کمزوری ہے کہ وہ ہر ظلم کے دوران میں یہ سمجھتے ہیں کہ اب شاید کوئی مہدی ہی انہیں نجات دلائے گا، لیکن شاید ابھی حالات اس نہج پر نہیں پہنچے جہاں امام مہدی کا ظہور ناگزیر ہو۔ (ادارہ)

مسلم نوجوانوں کی تعلیم

مسلمان جب تک مغربی تہذیب کی طرف اس نظر سے دیکھتے رہیں گے کہ وہ واحد طاقت ہے جو ان کے جامد معاشرہ میں جان ڈال سکتی ہے تو وہ اپنی خود اعتمادی کو نقصان پہنچاتے رہیں گے اور بالواسطہ طور پر مغرب کے اس دعوے کی تصدیق کرتے رہیں گے کہ اسلام چلا ہوا کارتوس ہے۔

میں نے پچھلے ابواب میں اپنے خیال کے مطابق یہ بتایا ہے کہ اسلام اور مغربی تہذیب زندگی کے متعلق بالکل متضاد تصورات رکھتے ہیں اس لیے اپنی روح کے مطابق یہ دونوں ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ ایسے میں ہم یہ کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ مغربی خطوط پر مسلم نوجوانوں کی تعلیم جو مغرب کے ثقافتی تجربات اور اقدار پر مبنی ہے، اسلام دشمنی کے اثرات سے پاک ہو سکتی ہے؟ ہم یہ توقع کرنے میں حق بجانب نہیں، البتہ بعض صورتوں میں ہو سکتا ہے کہ انتہائی ذہین مسلم نوجوان مغربی نظام تعلیم کی برائیوں کا شکار ہونے سے بچ جائیں۔

مسلمان نوجوانوں کے لیے مغربی تعلیم لازمی طور پر پیغمبر ﷺ کے پیغام پر ایمان کو کمزور کر ڈالتی ہے اور اس عزم کو بھی کمزور کر دیتی ہے کہ وہ اسلام کی نمائندگی کریں۔ درحقیقت ہمارے دانشور طبقے نے مغربی اقدار اختیار کر لی ہیں اور ان میں مذہبی عقیدہ رفتہ رفتہ کمزور پڑتا جا رہا ہے۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسلام نے عملی مذہب ہونے کی اپنی حیثیت غیر تعلیم یافتہ طبقہ میں برقرار رکھی ہے۔ اگرچہ اس طبقہ میں اسلام سے بہت زیادہ جذباتی لگاؤ پایا جاتا ہے لیکن ان میں مغرب زدہ دانشور طبقہ کے مقابلہ میں اپنے فہم کے مطابق اسلام کا بڑا محدود تصور پایا جاتا ہے۔ مغرب زدہ دانشوروں کی اسلام سے بیگانگی کی یہ توجیہ نہیں کی جا سکتی ہے کہ مغربی سائنس نے ہماری مذہبی تعلیمات کے خلاف معقول

www.ebooksland.blogspot.com

دلائل فراہم کر دیے ہیں بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جدید مغربی معاشرہ کی ذہنی فضا مذہب کے سخت خلاف ہے۔ یہ فضا مسلمان نوجوان نسل میں مذہبی رجحانات کو کچل دیتی ہے۔

مذہب کا اقرار یا انکار صرف دلائل کا مسئلہ نہیں ہے۔ بعض صورتوں میں کوئی ایک رویہ وجدانی طور پر بھی اختیار کر لیا جاتا ہے جس کو ہم بصیرت بھی کہہ سکتے ہیں لیکن یہ عام طور پر انسان میں ثقافتی ماحول کے ذریعہ منتقل ہوتا ہے۔ ایک بچے کا تصور کرو جس کو بچپن ہی سے موسیقی کی آوازیں سننے کی باقاعدہ تربیت دی جاتی ہو۔ اس کے کان سر اور آہنگ سننے کے عادی ہو جاتے ہیں' اس لیے بعد میں وہ مشکل ترین موسیقی بھی سمجھ سکے گا۔ ایک بچہ جس نے اپنی ابتدائی زندگی میں موسیقی سے ملتی جلتی کوئی چیز بھی نہ سنی ہو' بعد میں وہ عناصر موسیقی کی داد دینا مشکل پاتا ہے۔ یہی بات مذہب کے معاملہ میں بھی صادق آتی ہے۔ جس طرح یہ امکان ہے کہ بعض افراد موسیقی کے لیے ''کان'' سے محروم ہوں اسی طرح یہ امکان بھی موجود ہے کہ بعض لوگ مذہب کی آواز سننے کے معاملہ میں بہرے ہوں۔ لیکن عام انسانوں کی عظیم اکثریت کے مذہب کے اقرار یا انکار کا انحصار اس امر پر ہوتا ہے کہ انہوں نے کس ماحول میں پرورش پائی ہے۔ اسی لیے پیغمبر ﷺ نے فرمایا:

«كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ»(صحيح البخاري، الجنائز، باب ما قيل في أولاد المشركين، حديث: ١٣٨٥)

''ہر بچہ فطرت سلیم پر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے والدین اس کو یہودی' عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔''⑦

⑦ فطرت سے مراد کسی ذی شعور وجود کی اصلی طبیعت یا اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت کا پیدائشی شعور ہے۔ (لسان العرب' تاج العروس وغیرہ) فطرت ہر انسان میں پیدائشی ہوتی ہے۔ (سورہ 30:30 اور The Message of The Quran کا نوٹ 27 صفحہ 321 اور سورہ 172:7 The Message of the Quran کا نوٹ 139 صفحہ 230) اس لیے اسلام کو دین فطرت کہا جاتا ہے۔ ... کے معنی یہ ہیں کہ یہ انسان کے اندرونی ... کا مکمل جواب ہے۔

اس حدیث میں لفظ ''والدین'' کو منطقی طور پر توسیع دے کر عام ماحول مراد لیا جا سکتا ہے یعنی خاندانی زندگی' اسکول اور معاشرہ وغیرہ جس کے ذریعہ بچے کی ابتدائی زندگی تشکیل پاتی ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زوال کی موجودہ صورتحال میں بہت سے مسلمان گھرانوں کا مذہبی ماحول اور عقلی معیار بہت پست ہو گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ نوجوان مذہب کو پس پشت ڈال دیں۔ لیکن مغربی خطوط پر مسلمان نوجوانوں کی تعلیم کا غالباً یہ نتیجہ نکلے گا کہ وہ اپنی زندگی میں مذہب مخالف رویہ اختیار کر لیں۔

لیکن یہاں یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ جدید علم کے متعلق ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے؟

مغربی تعلیم کے خلاف مسلمانوں کے احتجاج کے ہرگز یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ اسلام تعلیم کا مخالف ہے۔ ہمارے مخالفین کے اس الزام کی بنیاد نہ تو مذہب میں ہے اور نہ تاریخ میں ہے۔ قرآن مجید میں بار بار علم حاصل کرنے پر زور دیا گیا ہے ''تاکہ تم سمجھ سکو۔ تاکہ تم غور کر سکو۔ تاکہ تم جانو۔'' قرآن مجید کی ابتدائی سورت میں بتایا گیا ہے:

﴿ وَعَلَّمَ ءَادَمَ ٱلْأَسْمَآءَ ﴾(البقرة: ٢/ ٣١)

''اور آدم کو تمام نام سکھائے۔''

اور بعد کی آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جو نام سکھائے ان کی وجہ سے بعض اعتبار سے انسان فرشتوں سے بھی افضل ہے۔ ''نام'' اصطلاحات کو بیان کرنے کی قدرت یا قوت ناطقہ کا علامتی اظہار ہیں۔ یہ صفت صرف انسانوں کے ساتھ مخصوص ہے جس کی وجہ سے قرآن مجید کے مطابق انسان زمین پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ بنا۔ دوسرے الفاظ میں انسان کو علم حاصل کرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا ہے:

«طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ»(سنن ابن ماجة، المقدمة، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، حديث: ٢٢٤)

''ہر مسلمان (مرد اور عورت) کا علم حاصل کرنا مقدس فریضہ ہے۔''

«وَمَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَطْلُبُ بِهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللهُ لَهُ طَرِيقًا إِلَى الْجَنَّةِ»(صحيح البخاري، العلم، باب العلم قبل القول والعمل)

''اور جو شخص حصول علم کے لیے سفر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان بنا دیتا ہے۔''

«فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ، كَفَضْلِ الْقَمَرِ عَلَى سَائِرِ الْكَوَاكِبِ»(جامع الترمذي، العلم، باب في فضل الفقه على العبادة، حديث: ٢٦٨٢)

''عالم شخص کی عابد پر اسی طرح فضیلت ہے جیسے چاند کی ستاروں پر فضیلت ہے۔''

اسلام کے نزدیک علم کی جو اہمیت ہے اس کے لیے قرآن و احادیث کے حوالے ضروری نہیں ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ اسلام نے علم کو جتنی اہمیت دی کسی بھی دوسرے مذہب نے اتنی نہیں دی۔ اسلام نے علم اور سائنسی تحقیق کی جو حوصلہ افزائی کی ہے اس کا نتیجہ امویوں اور عباسیوں کے عہد اور سسلی اور اسپین میں عربوں کی حکومت کے دور میں شاندار ثقافتی کارناموں کی صورت میں برآمد ہوا۔ میں یہ ذکر اس لیے نہیں کر رہا ہوں کہ جب مسلم دنیا نے اپنی روایات کو ترک کر دیا ہے' روحانی طور پر اندھے اور ذہنی طور پر مفلس ہو چکے ہیں تو میں شاندار ماضی پر فخر کر سکوں کیونکہ موجودہ زبوں حال کے زمانہ میں ہمیں اپنے شاندار ماضی پر فخر کرنے کی ضرورت نہیں لیکن ہمیں یہ احساس ضرور کرنا چاہیے کہ ہماری زبوں حالی کی وجہ ہماری لاپروائی ہے اور اس کی وجہ ہرگز یہ نہیں ہے کہ اسلامی تعلیمات میں کوئی کمی ہے۔

اسلام کبھی بھی ترقی اور سائنس کی راہ میں حائل نہیں رہا۔ وہ انسان کی عقلی سرگرمیوں کو اس قدر پسند کرتا ہے کہ اس کو فرشتوں سے افضل قرار دیتا ہے۔ کسی اور مذہب نے عقل پر اتنا زور نہیں دیا جتنا اسلام نے دیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انسانی زندگی کے تمام مظاہر میں علم کو فوقیت حاصل ہے۔ اگر ہم اسلام کے اصولوں پر عمل کریں تو اپنی زندگیوں سے جدید

علوم کو خارج کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہمیں علم حاصل کرنے اور ترقی کرنے کا عزم کرنا چاہیے تاکہ ہم سائنس اور اقتصادی میدان میں مغربی اقوام کی ہمسری کر سکیں۔ لیکن مسلمانوں کو ہر چیز کو مغربی آنکھ سے دیکھنے اور مغربی انداز فکر اختیار کرنے کی خواہش ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔ اگر وہ مسلمان رہنا چاہتے ہیں تو انہیں اسلام کی روحانی تہذیب کا مغرب کے مادہ پرستانہ تجربات سے تبادلہ کرنے کی خواہش بھی نہیں کرنی چاہیے' خواہ یہ تجربہ سرمایہ دارانہ نظام یا مارکسی نظام کی صورت میں ہو۔

علم بذات خود نہ تو مغربی ہے اور نہ مشرقی بلکہ یہ آفاقی ہے جیسے کہ قدرتی حقائق آفاقی ہیں لیکن جس زاویہ سے حقائق کو دیکھا جائے اور ان کو پیش کیا جائے وہ زاویہ قوموں کے ثقافتی ذوق کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ بیالوجی' باٹنی یا فزکس اپنے دائروں میں نہ تو مادی ہیں اور نہ ہی روحانی۔ ان کا تعلق مشاہدہ اور حقائق کی جمع و تدوین سے ہے جن سے عام قواعد اخذ کیے جاتے ہیں لیکن وہ استقرائی فلسفیانہ نتائج جو ہم ان سائنسوں یعنی فلسفۂ سائنس سے حاصل کرتے ہیں ان کی بنیاد صرف حقائق اور مشاہدات پر نہیں ہوتی بلکہ بڑی حد تک ان کا انحصار زندگی اور اس کے مسائل کے متعلق ہمارے وجدانی یا ذوقی رویہ پر ہوتا ہے۔ عظیم جرمن فلسفی کانٹ نے کہا ہے'' اگرچہ یہ بات حیران کن نظر آتی ہے لیکن یقینی ہے کہ ہماری عقل قدرت سے نتائج اخذ نہیں کرتی بلکہ اس سے منسوب کرتی ہے۔'' مختصر یہ کہ یہاں صرف داخلی زاویۂ نظر کی اہمیت ہے کیونکہ یہ ہمارے زیر مشاہدہ مختلف امور کی تعبیر و تشریح کو بنیادی طور پر متاثر کرسکتا ہے۔ پس سائنس جو نہ تو مادہ پرستانہ ہے اور نہ روحانی ہے' کائنات کی متضاد توجیہات کی طرف رہنمائی کر سکتی ہے۔ ہمارے پہلے سے قائم شدہ تصورات کے مطابق یہ توجیہات روحانی یا مادی ہو سکتی ہیں۔ اگرچہ مغرب کی دانش بہت ارفع ہے لیکن وہ ہے تو مادہ پرستانہ' اس لیے اپنے تصورات اور بنیادی مفروضوں کے اعتبار

سے مذہب کے خلاف ہے' لہٰذا مغرب کا نظامِ تعلیم بھی بحیثیت مجموعی لازماً مذہب کے خلاف ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں جدید تجرباتی سائنس کا مطالعہ اسلام کی ثقافتی حقیقت کے لیے مضر نہیں ہوسکتا بلکہ مغربی تہذیب کی روح' جس کے ذریعے مسلمان سائنس کا مطالعہ کرتے ہیں' ضرررساں ہے۔

بدقسمتی سے ہماری صدیوں کی بے تعلقی اور غفلت نے ہمیں سائنسی ریسرچ کے متعلق یورپ اور امریکہ کے ذرائع علم پر انحصار کرنے پر مجبور کردیا ہے۔ اگر ہم نے اسلامی اصول پر عمل کیا ہوتا جس نے ہر مسلمان مرد اور عورت پر علم حاصل کرنا فرض قرار دیا ہے تو ہمیں جدید علوم کے لیے یورپ اور امریکہ کی طرف اس طرح نہ دیکھنا پڑتا جس طرح ریگستان میں پیاس سے تڑپتا ہوا شخص سراب کی طرف دیکھتا ہے۔ مسلمانوں نے طویل عرصے سے اپنے فرائض سے غفلت برتی ہے' اس لیے جہالت اور غربت میں مبتلا ہو چکے ہیں جبکہ اس عرصے میں یورپ نے زبردست ترقی کی ہے۔ اس خلا کو پر کرنے میں بڑا وقت لگے گا۔ اس وقت تک جدید علوم ہمیں مغرب ہی سے حاصل کرنے ہوں گے اور اس کے لیے ان کا ممنون ہونا پڑے گا۔ ہمیں مغرب کے سائنسی علوم اور طریقہ کو سیکھنے پر اکتفا کرنا چاہیے' اس کے سوا اور کچھ نہیں سیکھنا چاہیے۔ دوسرے الفاظ میں ہمیں ان سے نیچرل سائنسز سیکھنے میں ہچکچانا نہیں چاہیے لیکن ان کے فلسفہ کو اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت بہت سی نیچرل سائنسز' مثال کے طور پر ایٹمی فزکس' خالص تجرباتی تحقیقات سے آگے نکل کر فلسفہ کی حدود میں داخل ہو چکی ہیں' اس لیے بہت سی صورتوں میں تجرباتی سائنس اور قیاسی فلسفہ کے درمیان واضح خط کھینچنا انتہائی مشکل ہے۔ یہ بات بالکل صحیح ہے لیکن یہی وہ نقطہ ہے جہاں اسلامی ثقافت کو اپنا جوہر دکھانا ہوگا۔ مسلمان سائنسدانوں کا یہ فرض ہے کہ جب وہ سائنسی تحقیقات کے ان حدود فاصل پر پہنچیں تو مغرب کے فلسفیانہ نظریوں سے

بے نیاز ہوکر آزادانہ طور پر اپنے فلسفیانہ دلائل کی قوت کو استعمال کریں۔ توقع ہے کہ وہ اسلامی فلسفیانہ طرزِ فکر کو استعمال کر کے جدید مغربی سائنسدانوں کی اکثریت کے اخذ کردہ بیشتر نتائج سے مختلف نتائج پر پہنچیں گے۔

قطع نظر اس سے کہ مستقبل میں کیا ہوگا' آج بھی یہ ممکن ہے کہ مغرب کے عقلی رویہ کی غلامی اختیار کیے بغیر سائنس کی تعلیم حاصل کی جاسکتی ہے اور اس کی تدریس بھی ہوسکتی ہے۔ آج عالمِ اسلام کو نئے فلسفیانہ نقطۂ نظر کی ضرورت نہیں بلکہ اس کو تازہ ترین سائنسی اور فنی تعلیم اور ذہنی سازوسامان کی ضرورت ہے۔

اگر مجھے اسلامی نقطۂ نظر سے ایک مثالی تعلیمی بورڈ کے قیام کے لیے تجاویز پیش کرنا ہوں تو میں تجویز کروں گا کہ مغرب نے نیچرل سائنسز اور ریاضیات میں جو ذہنی کامیابیاں حاصل کی ہیں (متذکرہ تحفظات کے ساتھ) وہ مسلم اسکولوں میں پڑھائی جائیں اور یورپی فلسفہ ادب اور تاریخ کو اولیت نہ دی جائے جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے۔ میں نے اوپر جو کچھ کہا ہے اس کی روشنی میں یورپی فلسفہ کے متعلق ہمارا رویہ یہی ہونا چاہیے۔ جہاں تک یورپی ادب کا تعلق ہے اس کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کو مناسب لسانی اور تاریخی پوزیشن پر رکھنا چاہیے۔ آج کل بہت سے مسلمان ملکوں میں یورپی ادب جس طرح پڑھایا جاتا ہے وہ نامناسب ہے۔ مغربی اقدار اور تصورات کی افادیت میں جس طرح بے پناہ مبالغہ کیا جاتا ہے اس سے فطری طور پر نوجوانوں کے کچے ذہنوں میں منفی پہلوؤں کو جانے بغیر مغربی تہذیب کی روح پیدا ہو جاتی ہے۔ اس طرح نہ صرف مغربی اقدار کی تحسین کے لیے زمین ہموار ہو جاتی ہے بلکہ ان اقدار پر مبنی سماجی نظام کی عملاً نقالی بھی شروع ہو جاتی ہے جو اسلام کی روح کے خلاف ہے۔ مسلمانوں کے اسکولوں میں یورپی ادب کی موجودہ تعلیم کی جگہ معقول' امتیازی اسلامی ادب کی تعلیم دینی چاہیے تاکہ طلبہ کو ان کی اپنی ثقافتی دولت اور اس

کی گہرائی سے روشناس کرایا جائے اور اس طرح مستقبل کے لیے نئی امید پیدا کی جاسکے۔

بہت سے مسلمان اداروں میں آج جس طرح یورپی ادب پڑھایا جاتا ہے اس سے مسلم نوجوانوں میں اسلام سے دوری پیدا ہو جاتی ہے اور مزید خرابی یہ ہوتی ہے کہ مسلم نوجوان عالمی تاریخ کی مغربی تعبیر کو قبول کر لیتے ہیں۔ اس طرح پرانا رویہ ''رومن بمقابلہ بربری'' سامنے آجاتا ہے۔ مغرب کسی اعتراف کے بغیر تاریخ کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ دنیا میں اب تک جتنی نسلیں اور تہذیبیں پیدا ہوئیں' مغربی نسلیں اور ان کی تہذیب ان سب سے افضل ہے۔ اس طرح دنیا پر مغرب کے غلبہ کا اخلاقی جواز پیدا ہوتا ہے۔ رومیوں کے زمانہ سے یورپی اقوام مشرق اور مغرب کے درمیان ہر قسم کے فرق کو اپنے ''معیارات'' سے دیکھتی آئی ہیں کیونکہ وہ سمجھتی ہیں کہ انسانیت کی ترقی کا پیمانہ یورپی ثقافتی تجربات ہیں۔ اس تنگ نظری سے مسخ شدہ تناظر پیدا ہونا لازمی ہے۔ اور مشاہدے کے خطوط مفروضہ یورپی ''معیار'' سے جتنے دور ہٹتے چلے جاتے ہیں' مغرب کے باشندوں کیلئے زیر نظر تاریخی مسائل کی حقیقی معنویت اور ساخت کو سمجھنا' اتنا ہی دشوار ہو جاتا ہے۔

مغربی لوگوں کی انا پرستی کی وجہ سے حالیہ زمانہ تک دنیا کی جو تاریخ لکھی گئی ہے وہ مغربی تاریخ کی توسیع کے سوا کچھ نہیں جس میں غیر مغربی قوموں کا صرف اسی صورت میں ذکر کیا گیا ہے جب ان کی موجودگی اور ترقی کا یورپ یا امریکہ کی تقدیر پر براہ راست اثر پڑا ہے۔ لیکن اگر آپ مغربی اقوام کی تاریخ کو بڑی تفصیل اور واضح طور پر پیش کریں اور بقیہ دنیا کی تاریخ کی صرف جھلک دکھائیں تو قاری اس فریب کا شکار ہو جائے گا کہ سماجی اور عقلی اعتبارات سے یورپ اور امریکہ کی کامیابیاں بقیہ دنیا کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا صرف مغرب اور اس کی تہذیب کے لیے بنائی گئی ہے اور دوسری تہذیبوں کا مقصد صرف مغربی تہذیب کی شان و شوکت کے لیے مناسب ماحول تشکیل دینا

ہے۔ غیر یورپی نوجوانوں کے ذہنوں پر اس تاریخی تربیت کا یہی اثر ہو سکتا ہے کہ ان میں اپنی ثقافت' تاریخ' ماضی اور مستقبل کے متعلق احساس کمتری پیدا ہو جائے۔ مغربی نظام تعلیم میں ان نوجوانوں کو باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے مستقبل سے مایوس ہو جائیں اور یہ سمجھ لیں کہ مغربی آئیڈیلز کے سامنے سر جھکا کر ہی وہ اپنا مستقبل سنوار سکتے ہیں۔

ان منفی اثرات کا مقابلہ کرنے کے لیے اسلامی فکر کے رہنماؤں کو مسلمانوں کے اداروں میں تاریخ کی تعلیم پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ یہ بلاشبہ مشکل کام ہے اور اس کے لیے دنیا کی تاریخ کو بھی مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے لکھنا ہوگا اور اس سے قبل ہماری تاریخی تعلیم و تربیت کو اوور ہال کرنا پڑے گا۔ یہ کام مشکل تو ہے لیکن ناممکن نہیں اور یہ انتہائی ضروری کام ہے ورنہ ہماری نوجوان نسل کے ذہنوں میں مغرب کے پھیلائے ہوئے اسلام کی تحقیر کے جراثیم پیدا ہو جائیں گے جس کے نتیجہ میں احساس کمتری شدید تر ہو جائے گا۔

ہمارا یقین ہے اور مغرب کے حالیہ واقعات نے اس کی تصدیق کر دی ہے کہ اسلام کی اخلاقیات' سماجی اور ذاتی اخلاق' انصاف اور آزادی کے تصورات مغربی تہذیب کے تصورات اور افکار سے کہیں زیادہ ارفع و اعلیٰ ہیں۔ اسلام نسلی منافرت کی مذمت کرتا ہے اور انسانی اخوت اور مساوات کی راہ دکھاتا ہے لیکن مغربی تہذیب ابھی تک نسلی اور وطنی تعصبات کی تنگناؤں سے باہر نہیں نکل سکی ہے۔ اسلامی معاشرہ میں طبقات اور طبقاتی کشمکش کی کوئی گنجائش نہیں لیکن مغربی تہذیب قدیم یونان اور روم سے لے کر اب تک طبقاتی کشمکش اور سماجی نفرت سے بھری ہوئی ہے۔ بار بار اس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ مسلمان مغرب سے صرف ایک مفید چیز سیکھ سکتے ہیں اور وہ نیچرل سائنسز اور ان کی خالص اطلاقی شاخیں ہیں لیکن اس سے کسی مسلمان کو یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ مغربی تہذیب اسلامی تہذیب سے بہتر ہے۔ اگر وہ یہ سمجھتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اسلام سے بے بہرہ

ہے۔ کسی ثقافت یا تہذیب کی دوسری پر برتری کا پیمانہ سائنسی علم نہیں ہے (حالانکہ یہ علم
پسندیدہ ہے) بلکہ یہ برتری اخلاقی توانائی' انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تعبیر وتشریح
اوران میں تعاون پیدا کرنے کی صلاحیت سے ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے اسلام دوسری تمام
ثقافتوں سے افضل ہے۔ انسان جس بلند مقام تک پہنچ سکتا ہے وہ مقام اسلامی قواعد وضوابط
پر عمل کر کے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم اسلامی اقدار کی حفاظت اوران کا احیاء کرنا
چاہتے ہیں تو ہمیں مغربی تہذیب کی نقالی چھوڑنی ہوگی کیونکہ مغربی تہذیب کے ذہنی اثرات
سے اسلام کو فائدہ سے کہیں زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔

ماضی میں مسلمانوں نے سائنسی ریسرچ کی طرف سے غفلت ضرور برتی ہے لیکن اس
کے ازالہ کے لیے ہمیں مغربی علوم کو بلا سمجھے بوجھے قبول نہیں کر لینا چاہیے۔ ہماری سائنسی
پسماندگی اور غربت کے نقصانات اس زہریلے نقصانات کے مقابلہ میں کہیں کم ہیں جو
مغربی تعلیمی نظام کی اندھی تقلید سے ہوتے ہیں۔ یہ زہر عالم اسلام کے روحانی جسد میں بھی
سرایت کر رہا ہے۔ اگر ہم ثقافتی اعتبار سے اسلام کی صحیح معنوں میں حفاظت کرنا چاہتے ہیں
تو ہمیں مغربی تہذیب کے کھوکھلے پن سے اپنے آپ کو بچانا ہوگا جو ہمارے ذہنی رجحانات
اور سماجی ڈھانچہ کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ مغرب کے طور طریقوں اور طرز زندگی کی نقل کر کے
ہم بتدریج مغرب کے اخلاقی نقطۂ نظر کو اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور ظاہری وضع
قطع کی نقل کر کے ہم آہستہ آہستہ اس عالمی نقطۂ نگاہ کو قبول کرتے جارہے ہیں جو ان کی
ظاہری وضع قطع کا ذمے دار ہے۔

مغرب کی نقالی کیوں؟

مسلمانوں کی مغربی طرز زندگی کی انفرادی اور سماجی سطح پر نقالی بلاشبہ اسلامی تہذیب
کے وجود بلکہ احیاء کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ یہ ثقافتی بیماری کئی عشرے پہلے شروع
ہوئی۔ مسلمانوں نے جب مغرب کی مادی طاقت اور ترقی کو دیکھا اور اس کا اپنی افسوسناک
حالت سے موازنہ کیا تو انہیں سخت مایوسی ہوئی جس کی وجہ سے ان میں نقالی کا رجحان پیدا
ہوا۔ اسلام کی صحیح تعلیمات سے ناواقفیت کی بنا پر جس کی وجہ نام نہاد علماء کے گروہ کی تنگ
نظری ہے' مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ اس وقت تک دنیا کی ترقی کا ساتھ نہیں
دے سکتے جب تک کہ وہ مغرب کے سماجی اور اقتصادی طریقوں کو اختیار نہیں کر لیتے۔
چونکہ عالم اسلام جمود کا شکار ہے اس لیے بہت سے مسلمان اس سطحی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ
اسلام کا معاشرتی اور اقتصادی نظام ترقی کی ضروریات پوری نہیں کر سکتا لہٰذا اس میں مغربی
خطوط پر ترمیم ہونی چاہیے۔ یہ روشن خیال مسلمان یہ معلوم کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے
کہ مسلمانوں کے زوال میں اسلامی تعلیمات کا کس حد تک دخل ہے۔ یہ لوگ اسلام کی حقیقی
آئیڈیالوجی کی تحقیق بھی نہیں کرتے' البتہ وہ یہ کہتے ہیں اور صحیح کہتے ہیں کہ ان کے دور کے
دینیات کے ماہرین کی تعلیمات بہت سے معاملات میں مادی کامیابیوں کی راہ میں
رکاوٹ ہیں۔ لیکن ان لوگوں نے اصل مآخذ قرآن وسنت کی طرف رجوع کرنے کی
بجائے خاموشی سے شریعت کو جامد فقہ کے مترادف سمجھ لیا ہے' پھر یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ اس
میں بہت سے سوالوں کا جواب نہیں ہے لہٰذا ان کی شریعت سے عملاً تمام دلچسپیاں ختم ہو
گئیں اور انہوں نے اس کو قصۂ ماضی اور محض نظری کتابی علم سمجھ لیا۔ انہیں یہ توقع پیدا ہو

www.ebooksland.blogspot.com

گئی ہے کہ مغربی تہذیب کی نقل کر کے ہی عالمِ اسلام کو ادبار و انحطاط کی دلدل سے نکالا جا سکتا ہے۔

ان ''روشن خیال'' مسلمانوں کی گمراہ کن کوششوں میں دوسرے درجہ کی معذرت خواہانہ تحریروں کے سیلاب نے مدد دی جو بیسویں صدی کے پہلے دو عشروں میں منظرِ عام پر آئیں۔ ان تحریروں کے ذریعہ سے اسلام کی عملی تعلیمات کی نفی تو نہیں کی گئی لیکن ان کے ذریعہ یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی کہ اسلامی تعلیمات کو مغربی دنیا کے سماجی اور اقتصادی تصورات کے تابع کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح مغربی تہذیب کی نقالی کو جائز قرار دے دیا گیا اور یوں بتدریج اسلام کے بنیادی سماجی اصولوں سے لاتعلقی کی راہ ہموار ہو گئی۔ اس کے لیے ہمیشہ کی طرح اسلامی ''ترقی'' کا لبادہ اوڑھ لیا گیا۔ آج بیشتر ترقی یافتہ مسلمان ملکوں میں سے متعدد ملک اسی راہ پر گامزن ہیں۔

بہت سے مسلمان ''دانشور'' کہتے ہیں کہ اس بحث کی کوئی روحانی اہمیت نہیں ہے کہ ہم اس طرح رہتے ہیں یا اُس طرح' ہم مغربی لباس پہنتے ہیں یا اپنے آباء و اجداد کا لباس' ہمارے رسوم و رواج فرسودہ ہیں یا نہیں۔ اس قسم کی باتیں گمراہ کن ہیں۔ بلاشبہ اسلام میں تنگ نظری نہیں ہے۔ جیسا کہ اس کتاب کے پہلے باب میں بیان کیا گیا ہے' اسلام انسان کو اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے وسیع میدان پیش کرتا ہے بشرطیکہ مذہبی تعلیمات کی خلاف ورزی نہ کی جائے لیکن مغربی معاشرے کے کئی اہم پہلو اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں۔ مثال کے طور پر مردوں اور عورتوں کے آزادانہ میل جول اور اقتصادی سرگرمیوں کے لیے سرمایہ پر سود۔ صرف سطحی قسم کے لوگ ہی یہ سمجھ سکتے ہیں کہ کسی تہذیب کی ظاہری نقالی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس کی روح ان پر اثر انداز نہیں ہو گی۔ تہذیب ایک جاندار کی مانند ہوتی ہے۔ جیسے ہی ہم اس کی ظاہری شکل اختیار کرنا شروع کر

دیتے ہیں' اس کے اندرونی اثرات غیر محسوس طریقہ سے ہمارے پورے رویے میں سرایت کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس حقیقت کو پیغمبر ﷺ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

«مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ» (سنن أبي داود، اللباس، باب في لبس الشهرة، حديث: ٤٠٣١)

''جو شخص کسی قوم کی نقل کرتا ہے وہ ان ہی میں سے ہو جاتا ہے۔'' [8]

یہ مشہور حدیث محض اخلاقی انتباہ نہیں ہے بلکہ اس میں ایک معروضی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ درحقیقت مسلمان جس غیر مسلم تہذیب کے خارجی مظاہر کی نقالی کرتے ہیں وہ لازماً بتدریج ان کے رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے۔

ایسی صورت میں سماجی زندگی کے ''اہم اور غیر اہم'' پہلوؤں کے بنیادی فرق کو دیکھنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ اس تناظر میں کوئی چیز غیر اہم نہیں ہوتی' مثال کے طور پر اس سے بڑی کوئی غلط فہمی نہیں ہو سکتی کہ لباس کی حیثیت صرف ظاہری ہے اور اس کا انسان کی ذہنی اور روحانی شخصیت سے کوئی تعلق نہیں۔ لباس عوام کے صدیوں کے ذوق اور ضروریات کی بنیاد پر ترقی کرتے کرتے خاص شکل اختیار کرتا ہے۔ اس کا فیشن عوام کے جمالیاتی ذوق کے مطابق ہوتا ہے۔ عوام کے کردار اور رجحانات کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ لباس میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر آج کے مغربی فیشن جدید مغرب کے ذہنی اور اخلاقی کردار کی مکمل عکاسی کرتے ہیں۔ مسلمان اپنا لباس چھوڑ کر مغربی لباس اختیار کر کے لاشعوری طور پر

[8] مغربی معاشرے میں حالیہ عشروں میں جنسی آوارگی' بے راہ روی اور مرد و زن کے اختلاط کو بڑا فروغ حاصل ہوا ہے جو اسلام کی اخلاقی بنیادوں کے خلاف ہے۔ اس پر مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ جہاں تک سود کا تعلق ہے وہ جدید اقتصادی سرگرمیوں کا لازمی حصہ ہے لیکن یہ جان لینا چاہیے کہ مسلمانوں نے بلاسود اسلامی بینکنگ کا نظام قائم کرنے میں بڑی ترقی کی ہے۔ اس طرح ایک ایسے اقتصادی نظام کے قیام کی طرف پیش رفت ہوئی ہے جو شریعت کے تقاضوں کے مطابق ہو گا۔

مغرب کے مزاج کو اختیار کر لیتے ہیں اور ان کا ذہنی اور اخلاقی وجود تبدیل ہوتے ہوتے آخر کار نئے لباس کے "مطابق" ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے لوگوں کے ثقافتی تصورات کے بہت بڑے حصہ سے اعلان براءت کر دیتے ہیں اور رفتہ رفتہ وہ بیرونی تہذیب کے روایتی مزاج، ان کی جمالیاتی اقدار، ان کی پسند و ناپسند کو اختیار کر لیتے ہیں اور بالآخر وہ اس تہذیب کی ذہنی اور اخلاقی غلامی قبول کر بیٹھتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اگر کوئی مسلمان مغرب کے لباس، ان کی عادات و اطوار اور ان کی طرز زندگی کی نقالی کرتا ہے تو وہ اپنی تہذیب سے غداری کرتا ہے خواہ وہ ایسا نیک نیتی ہی سے کیوں نہ کرے۔ یہ ناممکن ہے کہ کسی بیرونی تہذیب کو پسند کیے بغیر اس کی نقالی جائے۔ اس طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ ایک ایسی تہذیب کی نقالی کی جائے جو مذہبی نظریہ زندگی کی مخالف ہو اور پھر اچھا مسلمان بھی رہا جائے۔

کسی غیر ملکی تہذیب کی نقالی احساس کمتری کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہی معاملہ ان مسلمانوں کا بھی ہے جو مغربی تہذیب کی نقالی کرتے ہیں۔ وہ اس کی طاقت، فنی استعداد اور ظاہری چمک دمک کا موازنہ عالم اسلام کی پستی سے کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں مغربی طرز زندگی اختیار کرنے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں۔ اپنی خامیوں اور کمزوریوں کے لیے اسلام کو مطعون کرنا آج کا فیشن بن چکا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہمارے نام نہاد دانشور معذرت خواہانہ رویہ اختیار کر لیتے ہیں اور اپنے آپ کو اور دوسروں کو قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مغربی اقدار کو اختیار کرنے کی راہ میں اسلام مانع نہیں ہے۔

عالم اسلام کی بیداری کے لیے ضروری ہے کہ اصلاحات کا سلسلہ شروع کرنے سے پہلے مسلمان اپنے مذہب اور سماجی ڈھانچہ کے متعلق معذرت خواہانہ رویہ ترک کریں۔ ایک مسلمان کو دنیا میں اپنا سر بلند کر کے رہنا چاہیے۔ اس کو یہ احساس ہونا چاہیے کہ وہ باقی دنیا سے مختلف اور ممتاز ہے جس پر اس کو فخر کرنا چاہیے اور اس فرق کو ایک قیمتی وصف کی حیثیت

سے محفوظ رکھنا چاہیے۔ معذرت کرنے اور دوسری ثقافتوں میں اس کو ضم کرنے کی بجائے اس قیمتی وصف کا پوری جرأت سے اعلان کرنا چاہیے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مسلمان بیرونی دنیا سے بالکل ہی بے تعلق ہو جائیں، البتہ انہیں اپنی تہذیب ترک کیے بغیر وقتاً فوقتاً بیرونی تہذیب کے نئے اور مثبت اثرات کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے۔ اس کی ایک مثال یورپ کی نشاۃ ثانیہ ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ یورپ نے کتنی جلدی عربوں کے علمی اثرات کو قبول کر لیا لیکن یورپ نے عربوں کی وضع قطع اور عرب ثقافت کی کبھی نقالی نہیں کی اور اپنی دانش اور جمالیاتی آزادی کو قربان نہیں کیا۔ یورپ نے عربوں کے اثرات کو اپنی زمین میں کھاد کے طور پر استعمال کیا جیسا کہ عربوں نے اپنے زمانہ میں یونانی اثرات کو استعمال کیا تھا۔ ان دونوں صورتوں میں روحانی دولت میں اضافہ ہوا اور ایک نئی اور توانا تہذیب نے جنم لیا جو اعتماد سے بھرپور اور پروقار تھی۔ کوئی بھی تہذیب اپنا وقار کھو کر اور ماضی سے رشتے کاٹ کر پھل پھول نہیں سکتی بلکہ زندہ بھی نہیں رہ سکتی۔

افسوس ہے کہ مسلم دنیا میں مغرب کی نقالی بڑھتی جا رہی ہے اور وہ مغربی خیالات اور تصورات کو اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اس طرح وہ بتدریج ماضی سے اپنا رشتہ کاٹتی چلی جا رہی ہے نہ صرف اپنی ثقافتی جڑیں بلکہ روحانی جڑیں بھی کاٹ رہی ہے۔ اس کی مثال اس درخت کی سی ہے جو بہت توانا تھا مگر اس کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے درخت آہستہ آہستہ گرتا چلا جا رہا ہے کیونکہ وہ اپنی غذا سے محروم ہو گیا ہے۔ اس کے پتے جھڑ چکے ہیں اس کی شاخیں ٹوٹ چکی ہیں۔ اب صرف تنا رہ گیا ہے جس کے گرنے کا خطرہ ہے۔

عالم اسلام اس وقت رو بہ زوال ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ایک عملی مذہب کو محض ظاہری رسوم و رواج کا مذہب بنا دیا گیا ہے اور اس کی روح نکال کر اسے بے جان کر دیا گیا ہے۔ اس کے احیاء کا صحیح طریقہ مغرب کی نقالی نہیں ہے۔ پھر سوال یہ ہے کہ مسلمان ذہنی اور عقلی

تحریک کے لیے جس کی انہیں آج شدید ضرورت ہے' کس طرف دیکھیں؟

جواب بڑا آسان ہے۔ درحقیقت جواب سوال ہی میں مضمر ہے۔ اس کا جواب اسلام ہے جس کے متعلق میں کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ یہ صرف عقیدہ نہیں بلکہ یہ انفرادی اور سماجی زندگی کا لائحہ عمل ہے۔ بیرونی ثقافت اس کو ہڑپ کر کے ختم کر سکتی ہے کیونکہ اس ثقافت کی اخلاقی بنیادیں بالکل مختلف ہیں۔ اس کا احیاء اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم اس کو اپنی ذاتی اور سماجی زندگی کے تمام پہلوؤں میں اختیار کریں۔

نئے خیالات اور متضاد رویوں کے زیر اثر جو موجودہ دور کی خصوصیت ہے' اسلام کھوکھلی صورت میں قائم رہنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اگر اس پر صدیوں سے طاری طلسمی نیند کو توڑ دیا جائے تو یہ زندہ ہو سکتا ہے ورنہ مر جائے گا۔ مسلمانوں کا حال اس وقت اس مسافر کا سا ہے جو دوراہے پر پہنچ چکا ہے۔ وہ وہیں کھڑا رہ سکتا ہے لیکن اس کے معنی فاقہ کشی کی موت ہوں گے۔ وہ اس راستہ کا انتخاب کر سکتا ہے جس پر سنگ میل لگا ہوا ہے: ''مغرب کی طرف'' لیکن اس صورت میں اسے ہمیشہ کے لیے اپنے ماضی سے رشتہ کاٹنا ہوگا۔ یا پھر وہ دوسرا راستہ اختیار کر سکتا ہے جس کا سنگ میل کہتا ہے: ''اسلام کی حقیقت کی طرف۔'' یہ راستہ صرف ان لوگوں کا ہے جو اپنے ماضی پر اور اس کو ایک جاندار مستقبل میں تبدیل کرنے کے امکانات پر یقین رکھتے ہیں۔

❀❀❀

حدیث اور سنت

پچھلے کئی عشروں میں اصلاح کی بہت سی تجاویز پیش کی گئی ہیں اور اسلام کے جسد بیمار کے لیے بہت سے روحانی ڈاکٹروں نے پیٹنٹ ادویات تجویز کی ہیں لیکن اب تک یہ تمام ادویات بے سود ثابت ہوئی ہیں کیونکہ چالاک ڈاکٹر اپنی ادویات' مقویات اور اکسیریات کے ساتھ وہ قدرتی غذا تجویز کرنا بھول گئے ہیں جس کی بنیاد پر مریض کی ابتدائی نشوونما ہوئی تھی۔ واحد غذا جس کو اسلام کا جسد' خواہ صحت مند ہو یا بیمار' ہضم کر سکتا ہے وہ پیغمبر محمد ﷺ کی سنت ہے۔ تیرہ صدیوں سے زائد عرصہ قبل اسلام کے عروج کی کلید سنت تھی اور کوئی وجہ نہیں کہ یہ موجودہ زوال کے اسباب کو سمجھنے کی کلید ثابت نہ ہو۔ اسلام کی بقا اور ترقی کے لیے سنت پر عمل ضروری ہے۔ مسلمانوں کے انتشار اور زوال کا سبب سنت سے غفلت ہی ہے۔ سنت بیت الاسلام کا لوہے کا قالب ہے۔ اگر آپ کسی عمارت کا قالب نکال دیں تو عمارت کے زمین بوس ہو جانے پر حیران نہیں ہونا چاہیے۔

سنت سے وابستگی ایک سیدھی سادی حقیقت ہے جس پر پوری اسلامی تاریخ میں اہل علم کا اتفاق رہا ہے مگر آج اس کی نامقبولیت کی وجہ مغربی تہذیب کا بڑھتا ہوا اثر ہے جس سے ہم سب بخوبی واقف ہیں۔ لیکن سنت واحد حقیقت ہے جو ہمیں انتشار اور موجودہ شرمناک زوال سے نکال سکتی ہے۔

سنت کی اصطلاح یہاں وسیع معنوں میں استعمال کی گئی ہے۔ اس سے مراد پیغمبر ﷺ کا قول و فعل اور ان کا رویہ ہے۔ ان کی فقیدالمثال زندگی قرآن مجید کی تفسیر ہے اور قرآن مجید سے اس سے زیادہ انصاف نہیں کیا جا سکتا کہ ہم پیغمبر ﷺ کا اتباع کریں جن

پر قرآن نازل ہوا۔⑨

ہم نے دیکھا ہے کہ اسلام کی اصل کامیابی جو اس کو دوسرے آسمانی نظاموں سے الگ کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ اس میں انسانی زندگی کے اخلاقی اور مادی پہلوؤں میں مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ظہور اسلام کے وقت اسلام کی عظیم الشان کامیابی کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس نے انسان کو یہ نیا پیغام دیا کہ جنت کے حصول کے لیے دنیا سے نفرت کی ضرورت نہیں ہے۔ اسلام کا ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ یہ بتاتا ہے کہ پیغمبر ﷺ کو جنہیں اللہ تعالیٰ

⑨ میں اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ اسلام کے کلاسیکل دور کے بعد علمائے کرام نے سنت کے دائرہ کو بلا ضرورت وسیع کر دیا ہے۔ اس کا بنیادی مفہوم اللہ کے پیغمبر کا ''طریق زندگی'' ہے۔ اس سے مراد یہ ہے: اول یہ کہ پیغمبر نے انسان کے مستقل نوعیت کے انفرادی اور سماجی مسائل کے متعلق جو اخلاقی طرز عمل اختیار کیا وہ سنت ہے۔ دوم، سنت حلال و حرام کے ان احکام نبوی پر مشتمل ہے جو سماجی اور انسانی زندگی کے نہ بدلنے والے حالات سے تعلق رکھتے ہیں، البتہ پیغمبر ﷺ نے خاص تاریخی مواقع یا خاص مدت کے لیے جن چیزوں کو حلال یا حرام قرار دیا وہ ان سے مستثنیٰ ہیں۔ سوم، پیغمبر ﷺ نے جن چیزوں کو اچھا یا برا قرار دیا ان پر وقت یا حالات کی تبدیلی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ جب تک ہم سنت کی اس ثلاثی تعریف کو پیش نظر نہیں رکھیں گے خطرہ ہے کہ ہم اس اصول سے دور ہو جائیں گے کہ سنت ہر زمانے کے لیے ہے اور اس طرح ہم اسلامی قوانین کے دوسرے ماخذ سے محروم ہو جائیں گے۔

نوٹ: ''سنت'' کے بارے میں مصنف کی یہ ''تثلیث'' اسی طرح ناقابل فہم ہے جیسے عیسائیوں کی ''تثلیث'' عقدۂ ناکشودہ ہے۔ اوّل تو محدثین کے نزدیک حدیث اور سنت مترادف (ہم معنی) الفاظ ہیں۔ ان کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ دوم: حدیث و سنت سے مراد نبی ﷺ کے اقوال، افعال اور تقریرات ہیں۔ سوم: ان سب کی حیثیت علی الاطلاق ہے، ان میں مستقل یا غیر مستقل، ابدی یا غیر ابدی کی کوئی تقسیم نہیں ہے۔ آپ کا ہر قول اور عمل مستقل، ابدی اور واجب الاطاعت ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ کے بعض افعال اختیاری ہیں، ان کو شرعاً فرض و واجب قرار نہیں دیا جا سکتا، تاہم ان کو فضل ضرور کہا جائے گا، جیسے آپ کا فقر و عسرت کی زندگی کو اختیار کرنا، وغیرہ۔ اسی طرح بعض عادات کو مباحات کے دائرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کی بنیاد پر حدیث و سنت کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ (ادارہ)

نے انسانیت کی رہنمائی کے لیے مبعوث کیا ہے، انسانی زندگی کے روحانی اور مادی دونوں پہلوؤں کو بہتر بنانے کی کیوں فکر تھی۔ اگر کوئی شخص روحانی معاملات اور معاشرے اور روزمرہ کی زندگی کے معاملات کے درمیان امتیاز برتتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اسلام کا گہرا فہم نہیں رکھتا۔ یہ دعویٰ کہ ہم روحانی امور کے متعلق احکامات کی پابندی کرنے کے تو ذمہ دار ہیں لیکن دوسرے امور کی پابندی کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی، اپنی روح کے اعتبار سے غیر اسلامی ہے۔ یہ ویسی ہی بات ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید کی بعض تعلیمات اس کے نزول وقت ''جاہل'' عربوں کے لیے تھیں اور وہ بیسویں، اکیسویں صدی کے ''مہذب'' لوگوں کے لیے نہیں ہیں۔ اس کی تہ میں پیغمبر عربی ﷺ کے کردار کو گھٹانے کا عجیب و غریب مبہم کام کر رہا ہے۔

جس طرح کہ مسلمان کی زندگی اس کی روحانی اور جسمانی زندگی میں مکمل تعاون کا مظہر ہوتی ہے، بالکل اسی طرح پیغمبر ﷺ کی رہنمائی ہماری زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے یعنی اخلاقی و عملی، انفرادی اور سماجی پہلوؤں کے لیے رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ سنت کے گہرے معنی یہی ہیں۔ قرآن مجید کہتا ہے:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ (النساء: ٤/ ٦٥)

''آپ کے پروردگار کی قسم! یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے تنازعات میں آپ کو منصف نہ بنائیں پھر جو فیصلہ آپ کریں اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں۔''

﴿قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۞ قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ ۖ فَإِن

﴿تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ ۝﴾ (آل عمران: ۳/ ۳۱-۳۲)

"(اے پیغمبر لوگوں سے) کہہ دیں اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور اللہ بڑا بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔ کہہ دیں کہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو۔ اگر وہ نہ مانیں تو اللہ بھی کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔"

اس لیے پیغمبر ﷺ کی سنت کا درجہ قرآن مجید کے بعد ہے اور یہ اسلامی قانون کا دوسرا ماخذ ہے۔ درحقیقت ہمیں سنت کی روشنی میں قرآنی تعلیمات کی تعبیر وتشریح کرنی چاہیے' تاکہ عملی زندگی میں مستقل اختلافات پیدا نہ ہوں۔ قرآن مجید کی متعدد آیات کے علاماتی معنی ہیں جن کو مختلف طریقوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔ بہت سے سوالات عملی اہمیت رکھتے ہیں جن کے متعلق قرآن مجید سے واضح رہنمائی نہیں ملتی۔ قرآن مجید کی روح ہر جگہ ایک ہی ہے لیکن اس سے ہر معاملہ میں عملی ہدایات اخذ کرنا آسان نہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور یہ مکمل اور جامع کتاب ہے۔ اس کے منطقی معنی یہ ہیں کہ اس کو پیغمبر ﷺ کی رہنمائی سے بے نیاز ہو کر استعمال نہ کیا جائے۔ پیغمبر ﷺ کی رہنمائی ہمیں ان کی سنت سے حاصل ہوتی ہے اور قرآن مجید کی تعلیمات کی تفسیر وتشریح ان سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا جن پر یہ کتاب انسانیت کی رہنمائی کے لیے نازل ہوئی۔

اب ہم اس اہم سوال پر پہنچتے ہیں کہ پیغمبر ﷺ کے قول وفعل کو روایت کرنے والے ذرائع کی صحت کا معیار کیا ہے جن سے نبی ﷺ کا اسوہ اور آپ کی تعلیمات ہم تک پہنچی ہیں۔ یہ ذرائع احادیث یعنی نبی ﷺ کے قول وفعل کی روایات ہیں جو صحابہ کرام ؓ نے بیان کی ہیں اور اسلام کی پہلی چند صدیوں میں ان پر جرح وتعدیل کے بعد انہیں جمع کیا گیا ہے۔ جدید دور کے بہت سے مسلمانوں کا کہنا ہے کہ وہ سنت پر عمل کرنے کو تیار ہیں بشرطیکہ

انہیں یقین ہو جائے کہ جن احادیث پر وہ مبنی ہیں وہ قابل اعتماد ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے دور میں اصولی طور پر بیشتر احادیث کے صحیح ہونے سے انکار کا فیشن بن گیا ہے' اس لیے سنت کے پورے ڈھانچہ کی صحت خطرہ میں پڑ گئی ہے۔

کیا اس طرز عمل کی کوئی سائنسی بنیاد ہے؟ کیا احادیث کو اسلامی قانون کے قابل اعتماد ماخذ کی حیثیت سے مسترد کرنے کا کوئی سائنسی جواز موجود ہے؟ منکرین حدیث کو ایسے معقول دلائل پیش کرنے چاہئیں جن سے ہمیشہ کیلئے یہ ثابت ہو جائے کہ نبی ﷺ سے منسوب احادیث کی روایات قابل اعتماد نہیں' لیکن اب تک ایسا نہیں ہو سکا ہے۔

عصر حاضر میں مشرق اور مغرب میں منکرین حدیث نے روایات کی صحت کو چیلنج کرنے کی پوری کوشش کی ہے لیکن وہ اپنی خالص ذاتی تنقید کے حق میں کسی سائنسی تحقیق کے نتائج کو پیش نہیں کر سکے۔ ایسا کرنا بڑا مشکل ہے کیونکہ احادیث کو جمع کرنے والے پہلے لوگوں خاص طور پر امام بخاری اور مسلم رحمہما اللہ نے ہر روایت کو درایت کے اصولوں پر سختی سے پرکھ کر اختیار کیا ہے۔ یہ اصول ان اصولوں سے زیادہ سخت ہیں جو مغربی مورخ تاریخی نوشتوں کو پرکھنے کے لیے عموماً استعمال کرتے ہیں۔

شروع کے محدثین کرام نے روایات کو پرکھنے کے لیے کونسا سخت طریقہ اختیار کیا تھا' اس پر بحث کرنا اس کتاب کے دائرے سے باہر ہے۔ ہمارے مقصد کے لیے یہ کہنا کافی ہوگا کہ پیغمبر ﷺ کی احادیث کے متن اور ان کی روایات کو جمع کرنے اور ان کو پرکھنے کے سلسلہ میں ایک پورا علم وجود میں آیا۔ راویوں کی زندگیوں کی ہر طرح جانچ پڑتال کی گئیں جس سے ایک تاریخی علم وجود میں آیا جس کو اسماء الرجال کہا جاتا ہے۔ اس میں ان تمام شخصیات کے تفصیلی سوانح کا اٹوٹ سلسلہ قائم کیا گیا جنہوں نے کبھی کوئی حدیث روایت کی تھی۔ احادیث کے راوی مردوں اور عورتوں کی زندگیوں کی ہر پہلو سے تحقیقات کی گئیں۔

صرف ان راویوں کی روایات قبول کی گئیں جو اپنے طرز زندگی اور روایات قبول کرنے اور بیان کرنے میں عظیم محدثین کے مقرر کردہ اصولوں پر سختی سے پورے اترتے تھے اور انتہائی سچے سمجھے جاتے تھے جتنا کہ کوئی تصور کر سکے۔ اس لیے اگر کوئی شخص کسی خاص حدیث کی صحت یا پورے مجموعہ احادیث کی صحت سے انکار کرتا ہے تو اس کے ثبوت کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے۔ کسی تاریخی ذریعے کی صحت پر اعتراض اٹھانے کی کوئی سائنسی بنیاد نہیں جب تک معترض یہ ثابت نہ کرے کہ وہ ذریعہ ناقابل اعتبار ہے۔ اگر خود اس ذریعے یا آگے روایت کرنے والوں میں سے ایک یا زائد کے خلاف کوئی معقول سائنسی دلیل پیش نہیں کی جا سکتی' اور اگر دوسری طرف اس معاملے میں کوئی تردیدی بیان بھی موجود نہیں تو ہم اس روایت کو صحیح ماننے پر مجبور ہیں۔

مثال کے طور پر اگر کوئی شخص محمود غزنوی کے ہندوستان پر حملوں کا ذکر کرتا ہے اور آپ اچانک کھڑے ہو کر یہ کہتے ہیں "میں نہیں سمجھتا کہ محمود کبھی ہندوستان آیا۔ یہ ایک بے سروپا داستان ہے جس کی کوئی تاریخی بنیاد نہیں۔" ایسی صورت میں کیا ہوگا؟ اسی وقت کوئی شخص جو تاریخ سے واقف ہوگا آپ کی غلطی درست کرنے کی کوشش کرے گا اور سلطان کے ہم عصروں کی رپورٹوں پر مبنی تاریخ کے حوالے دے کر ثابت کرے گا کہ محمود ہندوستان آیا تھا۔ ایسی صورت میں آپ کو ثبوت قبول کرنا پڑے گا ورنہ آپ کو پاگل تصور کیا جائے گا جو بلا وجہ ٹھوس تاریخی حقائق سے انکار کرتا ہے۔ اگر یہ درست ہے تو کوئی شخص پوچھ سکتا ہے کہ منکرین حدیث اسی منطقی انصاف پسندی سے کیوں کام نہیں لیتے۔

حدیث کے جھوٹا ہونے کی بنیادی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ روایت کے پہلے ذریعہ یعنی صحابی نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا ہو یا بعد کے راویوں نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا ہو۔ جہاں تک صحابی کا تعلق ہے تو اس کے جھوٹ بولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس قسم کے

مفروضے محض تخیل کی پرواز ہیں۔ پیغمبر ﷺ کی شخصیت نے اپنے صحابیوں اور صحابیات پر جو زبردست اثرات ڈالے ہیں وہ انسانی تاریخ کی ایک نمایاں حقیقت ہے جس کے شواہد سے تاریخ بھری ہوئی ہے۔ کیا یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ جو لوگ پیغمبر ﷺ کے ادنیٰ اشارہ پر اپنی جان و مال قربان کرنے کے لیے تیار رہتے ہوں وہ ان کے اقوال کے ساتھ چالبازی کریں گے۔ کیا پیغمبر ﷺ نے یہ نہیں کہا:

«مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ» (صحيح البخاري: العلم، باب إثم من كذب على النبي ﷺ، حديث: ١١٠)

"جو شخص جان بوجھ کر میرے متعلق جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔"

صحابہ کرام ؓ کو یہ بات معلوم تھی اور وہ پیغمبر ﷺ کی ہر بات پر کامل ایمان رکھتے تھے جنہیں وہ اللہ تعالیٰ کا رسول سمجھتے تھے۔ کیا نفسیاتی نقطۂ نظر سے یہ ممکن ہے کہ انہوں نے اس واضح حکم کی خلاف ورزی کی ہو؟

فوجداری مقدمہ کی سماعت کے دوران جج کے سامنے سب سے پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ اس جرم کے ارتکاب سے کس کو فائدہ پہنچا ہے۔ اس عدالتی اصول کو حدیث کے معاملہ میں بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ ان روایات کو چھوڑ کر جو بعض افراد یا گروہوں کی فضیلت سے براہ راست تعلق رکھتی ہیں اور جن کے جعلی ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور جن کو محدثین کرام نے مسترد کر دیا' پیغمبر ﷺ کی وفات کے بعد پہلی صدی میں مختلف جماعتوں کے سیاسی دعووں کے متعلق غلط روایات بیان کرنے میں کسی خاص فرد کا کوئی مفاد نظر نہیں آتا۔ اس امکان کے پیش نظر کہ بعض احادیث ذاتی فائدہ کے لیے گھڑی گئی ہوں' عظیم محدثین بخاری اور مسلم ؒ نے گروہی سیاست سے متعلق روایات کو قبول نہیں کیا۔ جو کچھ بچا ہے اس پر یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ ان روایات سے کسی کو ذاتی فائدہ پہنچا ہے۔

حدیث کی صحت سے انکار کی ایک دلیل یہ دی جا سکتی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ کسی صحابی نے

جس نے پیغمبر ﷺ کی زبان سے کوئی حدیث سنی ہو یا بعد کے راویوں میں سے کسی نے پیغمبر ﷺ کے الفاظ کو صحیح طور پر سمجھا نہ ہو، حافظہ نے ساتھ نہ دیا ہو یا کوئی اور نفسیاتی وجہ ہو جس سے کوئی غلطی ہوگئی ہو، حالانکہ وہ ذاتی طور پر صادق ہو، لیکن داخلی یعنی نفسیاتی شواہد بتاتے ہیں کہ اس قسم کی کسی بڑی غلطی کا امکان نہیں، خاص طور پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ایسی غلطی کا احتمال ممکن نہیں۔ جو لوگ پیغمبر ﷺ کی صحبت میں رہے ان کے نزدیک پیغمبر ﷺ کے ہر قول و فعل کی بڑی اہمیت تھی، صرف اس وجہ سے نہیں کہ ان پر پیغمبر کی شخصیت کا بڑا گہرا اثر تھا بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر پختہ ایمان رکھتے تھے کہ وہ اپنی زندگیاں رسول ﷺ کی ہدایات اور ان کے عمل کے مطابق استوار کریں۔ اس لیے یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کی ہدایات کو سرسری طور پر نہیں لے سکتے تھے، چنانچہ انہوں نے رسول ﷺ کی ہر بات اور ہر عمل کو انتہائی تکالیف اٹھا کر بھی اپنے حافظہ میں محفوظ رکھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دو دو افراد کی جماعتیں بنائی ہوئی تھیں جن میں سے ایک صحابی باری باری پیغمبر ﷺ کی صحبت میں رہتا تھا اور دوسرا صحابی اپنے معاشی امور اور دوسرے کاموں میں مصروف رہتا۔ اس طرح اور صحابی جو کچھ رسول اللہ ﷺ سے سنتے اور ان کے عمل کو دیکھتے، اپنے دوسرے ساتھی کو بتا دیتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل کو جاننے کے لیے کتنے بے تاب رہتے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ وہ رسول ﷺ کے کسی قول و عمل سے محروم نہ رہ جائیں۔ ان حالات میں یہ ممکن نہیں کہ وہ حدیث کے اصل الفاظ سے غفلت برتتے ہوں۔ اگر یہ ممکن تھا کہ سینکڑوں صحابی پورے قرآن مجید کے الفاظ، ان کے ہجوں اور ایک ایک جزئیات کو اپنے حافظہ میں محفوظ رکھ سکیں تو پھر یہ بھی ممکن تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پیغمبر ﷺ کے اقوال کو اپنے حافظہ میں محفوظ رکھیں جس میں نہ کوئی اضافہ ہو اور نہ کوئی لفظ چھوٹ جائے۔

مزید برآں ان ہی روایات کو مکمل صحیح سمجھا جاتا ہے جن کی مختلف آزاد ذرائع سے روایت کی گئی ہو اور راویوں کا سلسلہ منقطع نہ ہوا ہو۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ حدیث کے صحیح ہونے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے ہر مرحلہ میں کم از کم دو آزاد گواہ ہوں اور کسی بھی مرحلہ میں ایک ہی راوی نہ ہو، بلکہ حدیث صحابی اور محدث کے درمیان راویوں کی تین نسلوں سے روایت ہوئی ہو، جبکہ عملاً ایسے راویوں کی تعداد ۲۰ یا اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود کوئی مسلمان یہ نہیں سمجھتا کہ قرآن مجید کی صحت اور صداقت کا جو معیار ہے وہی احادیث کا بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی زمانہ میں احادیث کی چھان پھٹک کا کام بند نہیں ہوا۔ موضوع روایات کی موجودگی کی حقیقت کبھی محدثین کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوئی اگرچہ بعض غیر مسلم حتیٰ کہ بعض مسلمان بھی سمجھتے ہیں کہ درایت کا کام بند ہو گیا ہے۔ اس کے برعکس احادیث کی جرح و تعدیل کا فن ایجاد ہی اسی مقصد کے لیے ہوا ہے کہ صحیح اور موضوع احادیث کو الگ الگ کیا جائے۔ امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ اور دیگر محدثین اسی تنقیدی طرز عمل کی پیداوار ہیں۔ جھوٹی حدیثیں، احادیث کے پورے نظام کے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں کرتیں، جس طرح کہ الف لیلہ جیسی تخیلاتی داستانیں اس دور کے ٹھوس تاریخی حقائق کو جھٹلا نہیں سکتیں۔

اب تک کوئی بھی ناقد کسی منظم طریقے سے یہ ثابت نہیں کر سکا کہ ثقہ محدثین نے اصول جرح و تعدیل کے تحت جن احادیث کو اختیار کیا ہے وہ جعلی ہیں۔ صحیح روایات کا مکمل یا جزوی انکار محض جذباتی مسئلہ ہے اور بے لاگ سائنسی تحقیق کے ذریعے اس کے حق میں کوئی دلیل نہیں لائی جا سکی لیکن ہمارے دور میں بہت سے مسلمانوں کی طرف سے احادیث کے انکار کے محرک کو آسانی سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے موجودہ زوال پذیر طرز زندگی اور انداز فکر کو سنت نبوی کے مطابق ڈھالنا ممکن نہیں ہے۔ اپنی ان کمزوریوں

www.ebooksland.blogspot.com

اور ماحول کی خرابیوں کا جواز تلاش کرنے کے لیے احادیث کے جعلی ناقدین سنت کی پیروی سے اعراض کرنے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ وہ قرآن مجید کی تعلیمات کی اپنے رجحانات اور ذہن کے مطابق تعبیر کر سکیں اور اس طرح اخلاقی، عملی، انفرادی اور سماجی ضابطہ حیات کی حیثیت سے اسلام کے غیر معمولی مقام کو تباہ کیا جا سکے۔

اس زمانہ میں جب مسلمان ملکوں میں مغربی تہذیب کے اثرات بڑھتے جا رہے ہیں، نام نہاد مسلمان دانشوروں کے منفی رویہ میں ایک اور محرک کا اضافہ ہو گیا ہے کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ سنت رسول ﷺ پر بھی عمل کریں اور اس کے ساتھ ساتھ مغربی طرز زندگی بھی اختیار کریں۔ لیکن موجودہ نسل میں بہت سے مسلمان مغرب کی ہر چیز کو پسند کرتے ہیں اور بیرونی تہذیب کی محض اس لیے پرستش کرتے ہیں کہ وہ بیرونی ہے، طاقتور ہے اور مادی طور پر بڑی متاثر کن ہے۔ یہ مغرب پرستی ہی سب سے بڑی وجہ ہے کہ پیغمبر ﷺ کی احادیث اور سنت کا پورا نظام آج کل اتنا غیر مقبول ہو گیا ہے۔ سنت رسول ﷺ مغربی تہذیب کے پس پردہ بنیادی تصورات کے اس قدر خلاف ہے کہ جو لوگ مغربی تہذیب کے سحر میں گرفتار ہیں ان کیلئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ سنت کو غیر متعلق قرار دے دیں اور یہ کہیں کہ یہ اسلام کا لازمی جزو نہیں کیونکہ اس کی "بنیاد غیر معتبر روایات" پر ہے۔ اس کے بعد قرآن مجید کی تعلیمات کو توڑ مروڑ کر مغربی تہذیب کی روح کے مطابق پیش کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

سنت رسول ﷺ کے قانونی جواز کے ساتھ ساتھ جس کا تاریخی طور پر انحصار حدیث پر ہے، اس کے داخلی اور روحانی جواز کا سوال بھی پیدا ہوتا ہے۔ صحیح معنوں میں اسلامی زندگی گزارنے کے لیے سنت پر عمل کرنا کیوں ضروری ہے؟ کیا اسلام کی حقانیت جاننے کا کوئی اور طریقہ نہیں ہے کہ اسوۂ حسنہ کی روشنی میں مرتب ہونے والے اقوال و اعمال، اور اوامر و نواہی کے عظیم نظام پر عمل کیا جائے؟ بلاشبہ پیغمبر ﷺ سب سے بڑے انسان تھے لیکن کیا یہ

ضروری ہے کہ ان کی زندگی کے ہر پہلو پر عمل کیا جائے کیونکہ اس طرح انسان کی انفرادی آزادی مجروح ہو جاتی ہے؟ یہ فرسودہ دلیل ہے جو اسلام کے نادان دوست پیش کرتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ سنت پر عمل لازم قرار دینا ہی مسلمانوں کے زوال کا ایک بڑا سبب ہے کیونکہ اس طرح انسانی عمل کی آزادی اور معاشرہ کی فطری ترقی متاثر ہوتی ہے۔ اس اعتراض کا جواب اسلام کے مستقبل کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ سنت کے متعلق ہمارا رویہ اسلام کے متعلق ہمارے رویہ کو متعین کرے گا۔

ہمیں بجا طور پر فخر ہے کہ اسلام مذہب کی حیثیت سے جامد صوفیانہ تصورات پر مبنی نہیں کیونکہ اس پر دلائل کی بنیاد پر تنقید کی جا سکتی ہے۔ اس لیے ہمیں نہ صرف یہ جاننے کا حق ہے کہ سنت پر عمل لازم قرار دیا گیا ہے بلکہ ہمیں یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ یہ کیوں لازم قرار دیا گیا ہے۔

اسلام زندگی کے تمام پہلوؤں میں ہم آہنگی اور ہم رنگی چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لیے یہ زندگی کے تمام گوشوں کے لیے رہنمائی فراہم کرتا ہے جس میں نہ کچھ اضافہ کیا جا سکتا ہے اور نہ کچھ کمی کی جا سکتی ہے۔ اسلام میں ہر طرف منہ مارنے کی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن مجید اور رسول ﷺ نے جو بھی تعلیم دی ہے ہمیں اس کو مکمل طور پر اختیار کرنا ہوگا، ورنہ وہ اپنی قدر و قیمت کھو دے گی۔ یہ سوچنا بنیادی طور پر غلط فہمی پر مبنی ہے کہ چونکہ اسلام عقل کا مذہب ہے اس لیے وہ ہر فرد کو اس کی پسند کی تعلیمات کے انتخاب کا حق دیتا ہے۔ اس دعویٰ کی بنیاد عقلیت پرستی کی عام غلط فہمی پر ہے۔

ہر زمانہ کے فلسفہ میں اس بات کو پوری طرح تسلیم کیا گیا ہے کہ عقل اور عقلیت پرستی کے درمیان بڑی خلیج حائل ہے۔ جہاں تک مذہبی تعلیمات کا تعلق ہے، عقل ان کو کنٹرول کرتی ہے۔ یہ دیکھنا اس کا فرض ہے کہ انسانی ذہن پر ایسی کوئی بات مسلط نہ کی جائے جسے وہ ذہنی شعبدہ بازی کی مدد کے بغیر آسانی سے قبول نہیں کر سکتی۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے،

www.ebooksland.blogspot.com

کسی تعصب کے بغیر کہا جاسکتا ہے کہ عقل نے بار بار اسلام کے حق میں فیصلہ دیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس شخص کا بھی قرآن مجید سے تعلق قائم ہوتا ہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ اسکی تعلیمات کو بھی قبول کرے۔ یہ معاملہ مزاج، ماحول اور روحانی بصیرت کا ہے۔ ایک بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ کوئی بھی غیر متعصب شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ قرآن مجید میں کوئی بات عقل کے خلاف ہے۔ بلاشبہ اس میں بعض ایسے تصورات ہیں جو ہماری سرحد ادراک سے پرے ہیں لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے جو انسان کی عقل و خرد کی مخالف ہو۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا مذہبی امور میں عقل کا کام کنٹرول کرنا ہے۔ یہ ایسا آلہ ہے جو ہمیں "ہاں" یا "ناں" میں جواب دیتا ہے لیکن نام نہاد عقلیت پرستی کے متعلق یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ یہ اپنے آپ کو کنٹرول تک محدود نہیں رکھتی بلکہ چھلانگ لگا کر قیاس و گمان کے میدان میں پہنچ جاتی ہے۔ یہ دلیل کو قبول نہیں کرتی اور نہ خالص عقل کی طرح غیر جانبدار ہوتی ہے بلکہ انتہائی نفسی اور مزاجی ہوتی ہے۔ عقل کو اپنی حدود معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن سطحی "عقلیت پرستی" کا یہ دعویٰ انتہائی مبالغہ آمیز ہے کہ وہ دنیا کے تمام اسرار و رموز سے واقف ہے اور اپنے دائرہ میں تمام گتھیاں سلجھا سکتی ہے۔ مذہب کے معاملہ میں وہ یہ یقین نہیں رکھتی کہ بعض امور عارضی یا مستقل طور پر انسانی فہم سے بالا بھی ہوسکتے ہیں۔ وہ یہ غیر منطقی بات بھی کہتی ہے کہ سائنس تمام گتھیاں سلجھا سکتی ہے اور وہ خود بھی تمام اسرار و رموز سے آگاہ ہوسکتی ہے۔

اس قسم کی ناقابل تصور عقلیت پرستی کو بہت زیادہ اہمیت دینا ہی ان اسباب میں سے ہے جس کی وجہ سے جدید دور کے بہت سے مسلمان پیغمبر ﷺ کی رہنمائی قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں لیکن آج کائنات کی ضرورت نہیں ہے جو یہ بتائے کہ انسانی فہم اپنے امکانات میں بڑا محدود ہے۔ ہمارا دماغ اپنی نوعیت اور ساخت کے اعتبار سے کل کے تصور

کو نہیں سمجھ سکتا۔ ہم صرف اس کی تفصیلات ہی جان سکتے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ لامحدودیت یا ہمیشگی کے کیا معنی ہیں۔ ہم یہ تک نہیں جانتے کہ زندگی کیا ہے۔ آسمانی ہدایت پر قائم مذہب کے مسائل میں ہمیں ایسے رہنما کی ضرورت ہے جس کا دماغ عام عقلی صلاحیتوں اور عام نفسی عقلیت پرستی سے بلند ہو جس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں ایسے رہنما کی ضرورت ہے جسے بالاتر رہنمائی حاصل ہو۔

دوسرے الفاظ میں ہمیں ایک پیغمبر (ﷺ) کی ضرورت ہے۔ اگر ہمارا ایمان ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں تو ہم پر اخلاقی بلکہ عقلی طور پر بھی ان کا اتباع لازم ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم اپنی استدلال کی قوت سے ہاتھ دھو بیٹھیں بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں استدلال کی یہ قوت اپنے بہترین علم اور لیاقت کے مطابق استعمال کرنا ہوگی۔ ہمیں رسول ﷺ کے احکامات کا مقصد اور حکمت معلوم کرنا ہوگی۔ اگر ہمیں اس کی حکمت اور مصلحت سمجھ میں نہ آئے تب بھی ہمیں حکم کی تعمیل کرنا ہوگی۔

میں اس کو ایک سپاہی کی مثال سے واضح کرنا چاہتا ہوں جس کو اس کے جرنیل نے ایک اہم پوزیشن پر قبضہ کرنے کا حکم دیا ہو۔ اچھا سپاہی اس حکم پر فوراً عمل کرے گا۔ اگر حکم پر عمل کرتے وقت وہ اس کا مقصد اپنے آپ کو سمجھا سکے تو یہ اس کے لیے اور اس کے کیریئر کے لیے اچھا ہوگا لیکن اگر جرنیل کے حکم کی گہری حکمت اس کی سمجھ میں نہ آئے تو وہ حکم کی پابندی نہ کرنے یا اس پر عمل درآمد ملتوی کرنے کا مجاز نہیں ہوگا۔ ہم مسلمان ایمان رکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بہترین کمانڈر ہیں۔ ان سے بہتر کمانڈر کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ ہمارا ایمان ہے کہ وہ مذہب اور اس کے روحانی اور سماجی پہلوؤں کو ہم سے کہیں زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔ ان کے اوامر و نواہی کے پیچھے گہری حکمت و مصلحت ہوتی ہے جو ان کے نزدیک انسان کی روحانی یا سماجی بہبود کے لیے لازمی ہوتی ہے۔

بعض اوقات یہ حکمت واضح ہوتی ہے اور بعض اوقات عام آدمی کی غیر تربیت یافتہ آنکھیں اس کو دیکھ نہیں پاتیں۔ بعض اوقات ہم پیغمبر ﷺ کے حکم کی گہری حکمت کو سمجھ لیتے ہیں اور بعض اوقات ہم صرف اس کے ظاہری مقصد ہی کو سمجھ پاتے ہیں۔ جو بھی صورت ہو ہم پر پیغمبر ﷺ کا حکم ماننا لازم ہے بشرطیکہ حکم کی صداقت پوری طرح واضح ہو۔[10]

اس کے علاوہ اور کسی بات کی کوئی اہمیت نہیں۔ پیغمبر ﷺ کے احکامات میں بہت سے احکام انتہائی اہم ہیں اور دوسرے کم اہمیت کے حامل ہیں۔ اس لحاظ سے ہمیں انتہائی اہم احکام کو دوسرے احکام پر ترجیح دینی چاہیے۔ ہمیں کسی حکم کو یہ کہہ کر مسترد کرنے کا اختیار نہیں کہ یہ ہمارے لیے "غیر ضروری" ہے چنانچہ قرآن مجید میں پیغمبر ﷺ کے متعلق کہا گیا ہے:

﴿ وَمَا يَنطِقُ عَنِ ٱلْهَوَىٰٓ ۝ ﴾ (النجم: ۳/۵۳)

"وہ اپنی مرضی سے کوئی بات نہیں کہتا۔"

یعنی وہ صرف اسی صورت میں بات کہتا ہے جب اس کی ضرورت پیدا ہوتی ہے اور بات وہ اللہ تعالیٰ کی وحی کی روشنی میں کہتا ہے۔ اس لیے ہم پر پیغمبر ﷺ کے اتباع کا فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم اس کے احکام پر اس کی روح اور ظاہر کے مطابق عمل کریں اگر ہم اسلام پر سچے دل سے ایمان رکھتے ہیں۔ ہم اسلام کے متعلق یہ گمان نہیں کرتے کہ یہ بھی دوسرے نظریات کی طرح کا ایک نظریہ ہے بلکہ ہم سمجھتے ہیں کہ یہی ایک نظریہ ہے اور جس ہستی نے

---

[10] اس سلسلہ میں قاری کو حاشیہ 9 کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اس حاشیے پر مستزاد یہ ہے کہ بہت سی اخبار آحاد حتی کہ بعض صحیح احادیث کے مختلف اجزا مختلف راویوں نے بیان کیے ہیں اور یہ واضح سیاق و سباق کے بغیر روایت کیے گئے ہیں۔ ایسی صورت میں صرف احادیث کا گہرا علم رکھنے والے ہی بتا سکتے ہیں کہ فلاں حدیث کس سیاق و سباق میں ہے اور اس طرح وہ یہ واضح کر سکتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اس حدیث میں کیا بات فرمائی ہے۔

اس نظریے کو ہم تک پہنچایا ہے وہ دوسرے رہنماؤں کی طرح کے ایک رہنما نہیں بلکہ وہی ایک رہنما ہیں۔ تمام احکامات میں آپ ﷺ کی پابندی کرنا اسلام پر عمل کرنا ہے اور سنت کو ترک کرنا اسلام کی حقیقت سے روگردانی کرنا ہے۔

❀❀❀

نتیجہ

میں نے پچھلے ابواب میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مغربی تہذیب کو ہضم کرنے سے اسلام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا لیکن افسوسناک صورتحال یہ ہے کہ مسلم دنیا کے پاس مزاحمت کرنے کے لیے توانائی باقی نہیں رہی ہے۔ اس کے ثقافتی وجود کی باقیات مغربی خیالات اور رسوم ورواج کے دباؤ کے تحت زمین بوس ہو رہی ہیں۔ اب یہی دکھائی دیتا ہے کہ مسلمان اس صورت حال پر راضی ہو جائیں گے لیکن قوموں کی زندگی اور ثقافت میں اس کے معنی موت ہوتے ہیں۔

اسلام کا مسئلہ کیا ہے؟ کیا یہ واقعی چلا ہوا کارتوس ہے جیسا کہ ہمارے مخالفین اور ہماری اپنی صفوں کے شکست خوردہ عناصر ہمیں یقین دلاتے رہتے ہیں؟ کیا یہ اپنی افادیت کھو چکا ہے اور جو کچھ اس نے دنیا کو دینا تھا وہ دے چکا ہے؟

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انسانی ثقافتیں اور تہذیبیں جانداروں سے مشابہ ہوتی ہیں۔ وہ ان تمام مراحل سے گزرتی ہیں جن سے حیاتیاتی زندگی گزرتی ہے۔ وہ پیدا ہوتی ہیں، جوان ہوتی ہیں، پختہ عمر کو پہنچتی ہیں اور آخرکار زوال کا شکار ہو جاتی ہیں۔ پودوں کی طرح جو خشک ہو کر ختم ہو جاتے ہیں، ثقافتیں بھی اپنی عمر پوری کرنے کے بعد مٹ جاتی ہیں اور دوسری ثقافتوں کے لیے جگہ پیدا کر دیتی ہیں۔

کیا اسلام کا بھی یہی معاملہ ہے؟ سرسری نظر میں یہ ایسا ہی نظر آئے گا۔ بلاشبہ اسلامی ثقافت کا آغاز شاندار تھا۔ یہ ثقافت اپنے کمال کو پہنچی۔ اس میں انسانوں میں عمل اور قربانی کی تحریک پیدا کرنے کی قوت تھی۔ اس نے قوموں کو بدل دیا اور کرۂ ارض کی تقدیر بدل

دی۔ لیکن بدقسمتی سے بعد میں اس میں جمود پیدا ہو گیا اور یہ صرف الفاظ کا ظاہری جامہ بن کے رہ گئی اور اب ہم انتہائی مایوسی کے عالم میں اس کے زوال و انحطاط کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ لیکن کیا بات یہیں ختم ہو گئی؟

اگر ہمارا یقین ہے کہ اسلام دوسری ثقافتوں کی طرح کی ثقافت نہیں ہے اور یہ صرف انسانی افکار اور کوششوں کے نتیجہ میں وجود میں نہیں آیا بلکہ یہ ایک ایسی طاقت ہے جو خود ثقافت کو جنم دیتی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے جس کی ہر جگہ اور ہر زمانے میں انسانوں کو پابندی کرنی ہے تو پھر صورت حال بالکل بدل جاتی ہے۔ اگر اسلامی ثقافت اللہ تعالیٰ کے قانون کی پیروی کا نتیجہ ہے اور نتیجہ تھی تو ہم کبھی نہیں مان سکتے کہ یہ بھی دوسری ثقافتوں کی طرح گردش ایام اور کسی خاص دور کی اسیر ہے۔ بظاہر جو اسلام کا زوال نظر آتا ہے وہ درحقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہمارے دل مردہ ہو چکے ہیں، ہمارے دلوں پر مہر لگ چکی ہے، اس لیے ہم غیبی آواز کو نہیں سن سکتے۔ لیکن موجودہ حالات میں ایسے بھی کوئی آثار نظر نہیں آتے جن سے معلوم ہو کہ انسانیت اسلام سے آگے نکل چکی ہے کیونکہ انسانیت اسلام سے بہتر اخلاقی نظام وضع نہیں کر سکی ہے۔ وہ عملی طور پر انسانی اخوت کا تصور بھی نہیں پیش کر سکی جو اسلام نے امت کی صورت میں پیش کیا ہے۔ وہ کوئی ایسا سماجی ڈھانچہ بھی تیار نہیں کر سکی ہے جس میں انسانوں کے درمیان جھگڑوں اور کشمکش کو اتنی عمدگی سے کم کیا جا سکے جتنی عمدگی سے اسلام کے سماجی نظام نے کیا ہے۔ انسانیت، انسانی شرف، سلامتی کے احساس، روحانی امید اور اس کی خوشیوں میں بھی اضافہ نہیں کر سکی ہے۔

ان تمام امور میں نسل انسانی کی موجودہ کامیابیاں اسلامی پروگرام سے بہت کم ہیں۔

پھر اسلام کو از کار رفتہ قرار دینے کا کیا جواز ہے؟ محض اس لیے کہ اسلام کی بنیادیں خالص مذہبی ہیں اور مذہبی رجحانات کا اب فیشن نہیں رہا؟ لیکن اگر ہم یہ دیکھیں کہ مذہب کی بنیاد پر

قائم کوئی نظام زیادہ جامع' زیادہ ٹھوس اور انسانی نفسیات کے عین مطابق زندگی کا کوئی عملی پروگرام پیش کرتا ہے اور اب تک انسانی ذہن نے اصلاحات اور تجاویز کے ذریعے جو نقوم پیش کیے ہیں وہ اس سے بہتر نہیں ہیں تو کیا یہ مذہب کے حق میں وزنی دلیل نہیں ہے؟

اسلام کی بدولت انسان نے جو مثبت کامیابیاں حاصل کی ہیں ان سے اسلام کی حقانیت ثابت ہوگئی ہے۔ مزید برآں اسلام نے بہت پہلے انسانی ترقی کی جن خرابیوں' غلطیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی کردی تھی' انسانیت کو ان خرابیوں کا بعد میں علم ہوا' اس طرح بھی اسلام کی حقانیت ثابت ہوتی ہے۔ کسی شخص کے مذہبی عقائد سے قطع نظر خالص عقلی بنیادوں پر بھی ہر شخص کے لیے اسلام کی عملی رہنمائی کی پیروی کرنے کا پورا پورا جواز موجود ہے۔

اگر ہم اپنی تہذیب اور ثقافت کو اس نقطۂ نظر سے دیکھیں جو اوپر بیان کیا گیا ہے تو ہم لازماً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اس کا احیاء ممکن ہے۔ ہمیں اسلام کی اصلاح کرنے کی ضرورت نہیں جیسا کہ بعض مسلمان سمجھتے ہیں کیونکہ اسلام ہر لحاظ سے مکمل دین ہے۔ ہمیں جس چیز کی اصلاح کی ضرورت ہے وہ مذہب کے متعلق ہمارا رویہ ہے۔ وہ ہماری کاہلی' خود فریبی اور کوتاہ بینی ہے۔ مختصراً ہمیں اپنی خرابیوں کی اصلاح کی ضرورت ہے نہ کہ اسلام کی مفروضہ خرابیوں کو دور کرنے کی۔ اسلام کے احیاء کے لیے ہمیں باہر سے نئے اصول تلاش نہیں کرنے چاہئیں بلکہ ہمیں پرانے اصولوں پر عمل کرنا چاہیے جن کو ہم ترک کر چکے ہیں۔ ہم بیرونی ثقافتوں سے بعض باتیں ضرور سیکھ سکتے ہیں لیکن ہم مکمل اسلامی نظام کو کسی غیر اسلامی نظام سے بدل نہیں سکتے خواہ یہ نظام مشرق یا مغرب سے مستعار لیا جائے۔ اسلام کو بحیثیت روحانی اور سماجی ادارہ "بہتر بنانے" کی گنجائش نہیں۔ ان حالات میں بیرونی ثقافتی اثرات کے ذریعہ سے اسلام کے تصورات یا اس کے سماجی ڈھانچہ میں کوئی تبدیلی درحقیقت رجعت قہقری اور تباہ کن ہوگی' اور اس لیے نہایت افسوسناک ہوگی۔ تبدیلی ضرور ہونی

چاہیے لیکن یہ تبدیلی اندر سے ہونی چاہیے اور اسلام کی سمت میں ہونی چاہیے' اسلام سے ہٹتے ہوئے کسی اور راستہ پر نہیں ہونی چاہیے۔

ان تمام باتوں کے باوجود ہمیں اپنے آپ کو دھوکا نہیں دینا چاہیے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہماری دنیا یعنی اسلامی دنیا تقریباً اپنا آزاد ثقافتی عنصر کھو چکی ہے۔ میں یہاں مسلمانوں کے سیاسی زوال کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ ہمارے موجودہ حالات کی خرابی کا اہم ترین اظہار عقلی اور سماجی دائروں میں ملتا ہے جس کی وجہ ہمارے یقین اور ہماری ذہنی بیداری کا فقدان اور ہمارے سماجی ڈھانچہ کا انتشار ہے۔ آج کل ہم جس ثقافتی اور سماجی انتشار کے دور سے گزر رہے ہیں اس سے واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ وہ متوازن قوت ختم ہو چکی ہے جو کبھی اسلامی دنیا کی عظمت کا سبب تھی۔ کوئی نہیں جانتا کہ ہم کس ثقافتی انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہم میں ذہنی جرأت باقی نہیں رہی اور نہ ہم میں ہمارے مذہب اور معاشرہ کو تباہ کرنے والے بیرونی اثرات کے سیلاب کا مقابلہ کرنے یا اس سے بچنے کا عزم موجود ہے۔ ہم نے ان بہترین اخلاقی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا ہے جن سے دنیا کبھی آشنا تھی۔ ہم اپنے عقیدہ کو خود ہی جھٹلا رہے ہیں جبکہ ہمارے اسلاف کے لیے وہ ایک جاندار قوت تھا۔ ہم اپنے عقیدہ پر شرمندہ ہیں جبکہ وہ اس پر فخر کرتے تھے۔ ہم تنگ نظر اور خود غرض ہیں جبکہ وہ فراخ دل تھے اور دنیا کے سامنے کھلی کتاب تھے۔ ہم اندر سے خالی ہیں جبکہ وہ بھرے ہوئے تھے۔

ہر سوچنے سمجھنے والا مسلمان اس نوحہ سے بخوبی واقف ہے۔ ہر شخص نے اس کو بار بار سنا ہے۔ کیا اب اس کے اعادہ کا کوئی فائدہ ہے؟ میرا خیال ہے کہ اس کی افادیت ہے کیونکہ اپنی پستی کی خجالت سے نکلنے کا اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں کہ اس شرمندگی کا اعتراف کیا جائے اور اس کی تلخی کا ذائقہ چکھنے کے لیے اس کو دن رات پیش نظر رکھا جائے یہاں تک کہ ہم اس کے اسباب کو دور کرنے کا عزم کر لیں۔ ایک تلخ اور سنگین حقیقت کو اپنے آپ سے

چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اور اس خود فریبی کا بھی فائدہ نہیں کہ عالم اسلام اپنی اسلامی سرگرمیوں میں فزوں تر ہے اور چار براعظموں میں اسلامی مشن کام کر رہے ہیں اور مغربی عوام اسلام کی خوبیوں کے زیادہ سے زیادہ معترف ہوتے جا رہے ہیں۔ ان تمام باتوں کے نمائشی اظہار کا کوئی فائدہ نہیں اور اپنے آپ کو پر فریب دلائل سے مطمئن کرنے کا بھی حاصل کچھ نہیں کہ ہماری ذلت بے انتہا نہیں ہے حالانکہ اس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

لیکن کیا ہمارا انجام یہی ہونا ہے؟

ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ ہم میں احیاء کی تڑپ موجود ہے۔ بہت سے لوگوں میں یہ خواہش موجود ہے کہ ہمیں اپنی حالت بہتر بنانی چاہیے۔ یہ ہمیں امید دلاتی ہے کہ ابھی سب کچھ ختم نہیں ہوا۔ احیاء کا راستہ موجود ہے۔ یہ راستہ آنکھیں رکھنے والے ہر شخص کو صاف نظر آ رہا ہے۔

پہلے قدم کے طور پر ہمیں اسلام کے متعلق معذرت خواہانہ رویہ ترک کرنا چاہیے کیونکہ اس کے معنی ذہنی شکست ہیں اور اپنے شکوک و شبہات کو لبادہ اوڑھانا ہیں۔ دوسرا قدم شعوری طور پر اپنے رسول ﷺ کی سنت پر عمل کرنا ہے کیونکہ سنت اسلامی تعلیمات کی عملی شکل کے سوا کچھ نہیں۔ سنت کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں اختیار کر کے ہم آسانی سے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ مغربی تہذیب کی کس بات کو قبول کیا جا سکتا ہے اور کس کو رد کیا جا سکتا ہے۔ اجنبی عقلی معیارات کے سامنے بزدلی سے اسلام کو سرنگوں کرنے کی بجائے ہمیں ایک بار پھر اسلام کو وہ معیار بنانا چاہیے جس کی کسوٹی پر دنیا کو پرکھا جا سکے۔

لیکن یہ بات بھی درست ہے کہ آج کل اسلام کے اصل مقاصد کو نامناسب اور مقبول عام تشریحات کے ذریعہ غلط تناظر میں پیش کیا جاتا ہے۔ جو مسلمان اصل ماٰخذ تک واپس نہیں جانا چاہتے اور اس طرح اپنے تصورات کو درست کرنا نہیں چاہتے وہ اسلام اور

اسلامی امور کی جزوی طور پر مسخ شدہ تصویر پیش کرتے ہیں۔ ظاہر پرست علماء اسلام کے جو نظریات پیش کر رہے ہیں وہ ناقابل عمل تصورات ہیں جو اسلام کی روایتی تعبیرات کے سوا کچھ نہیں جن کی بنیاد نوفلاطونی منطق پر ہے جو ہو سکتا ہے کہ "جدید" ہو یعنی دوسری اور تیسری صدی ہجری میں "جدید" یعنی قابل عمل ہو لیکن اب وہ ازکار رفتہ ہو چکی ہے۔ مغربی خطوط پر تعلیم حاصل کرنے والے بیشتر مسلمان عربی سے نابلد ہوتے ہیں اور فقہ کے اسرار و رموز سے بھی واقف نہیں ہوتے' اس لیے وہ قدرتی طور پر فرسودہ اور داخلی تعبیرات کو قبول کرنے پر مائل ہوتے ہیں جو شارع علیہ السلام کے منشا کے مطابق نہیں ہوتیں' اور ان کے غلط ہونے سے انہیں جو مایوسی ہوتی ہے اس کی وجہ سے بیشتر لوگ اسلامی شریعت قبول کرنے ہی سے انکار کر دیتے ہیں۔ اس لیے شریعت کو ایک بار پھر مسلمانوں کی زندگی میں تخلیقی قوت بنانے کے لیے ہمیں اصل ماٰخذ کے مطابق اسلامی تصورات کا احیاء کرنا ہوگا' اور اس کو روایتی تعبیرات سے آزاد کرنا ہوگا جو صدیوں سے جمع ہو گئی ہیں اور عصر حاضر کے چیلنجوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ اس کوشش کے نتیجہ میں نئی فقہ وجود میں آ سکتی ہے جو اسلام کے دو ماٰخذ کے مطابق ہو۔ یہ دونوں ماٰخذ قرآن مجید اور اسوۂ حسنہ ہیں۔ ایسی فقہ ہی عصر حاضر کے تقاضے پورے کر سکتی ہے جیسا کہ قدیم فقہ نے اس دور کے تقاضے پورے کیے تھے جس پر ارسطاطالیسی اور نوفلاطونی فلسفہ کا غلبہ تھا' اور قرونِ اولیٰ کے حالات زندگی میں رہنمائی فراہم کی تھی۔

لیکن اگر ہم اپنے کھوئے ہوئے اعتماد کو دوبارہ حاصل کر سکیں تو ایک بار پھر آگے بڑھنے کی امید ہو سکتی ہے۔ یہ مقصد ہم اپنے سماجی اداروں کو تباہ کر کے کبھی حاصل نہیں کر سکتے اور نہ بیرونی تہذیب کی نقالی کے ذریعہ یہ مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے جو صرف تاریخی یا جغرافیائی اعتبار سے بیرونی تہذیب ہے بلکہ روحانی اعتبار سے بھی بیرونی ہے۔ قرآن مجید نے ہمیں یہ راستہ دکھایا ہے:

www.ebooksland.blogspot.com

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ ﴾ (الأحزاب: ۳۳/ ۲۱)

"تمہارے لیے رسول اللہ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی (کرنی) بہتر ہے (یعنی) اس شخص کیلئے جسے اللہ (سے ملنے) اور روز قیامت (کے آنے) کی امید ہو۔"

www.ebooksland.blogspot.com